بارِ خدا
(ناول)
محمد امین الدین

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

بارِ خُدا

(ناول)

محمد امین الدین

کتاب	بارِخدا (ناول)
مصنف	محمد امین الدین
اشاعت	مئی ۲۰۰۶ء
قیمت	۱۵۰ روپے
کمپوزنگ	ثاقب جاوید (بساطِ ادب)
سرورق	ثاقب جاوید
حقوق	مصنف

محمد امین الدین

۳ جنوری ۱۹۶۰ء

ایم اے معاشیات

ایم اے اردو

بیساکھیاں	(افسانے)	۱۹۹۶ء
سولہ آنے	(افسانے)	۱۹۹۸ء
اب کہانی میں بادشاہ نہیں ہوتے	(افسانے)	۲۰۰۱ء
کرداروں میں بٹی ہوئی زندگی	(افسانے)	۲۰۰۵ء
بارِخدا	(ناول)	۲۰۰۶ء

aminuddin60@hotmail.com

E-135/2B، بلاک 7، گلشن اقبال۔ کراچی 0300-2160532 4827530

میر ظہیر عباس روستمانی
rekhta

پاپا (خُسر)
امی (خوش دامن)
کے نام

ابتداء

۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو بلا کتوں کا اندیشہ جب پچاس ہزار تک پہنچ گیا اور یخ بستہ بارش اور برف کے ریشے دریدہ بدن اور زخموں سے چور انسانوں کی رگوں میں اترنے لگے تو وہی یخ بستگی میرے پورے وجود کو بھی نگلتی چلی گئی اور میں دہل کر رہ گیا۔ اس دوران کئی بار دل چاہا کہ ان لوگوں میں جا کر شامل ہو جاؤں جو چراغوں کو بجھنے سے بچانے میں مصروف ہیں۔ مگر ہر بار محض سوچ کر رہ گیا۔ تب میرے وجود میں چھپا افسانہ نگار قلم تھام کر بیٹھ گیا کہ میں اس زمین پر رہنے کا کچھ تو قرض ادا کروں۔ خیال جملوں میں ڈھلے، کردار بنے اور حقیقتوں کی قرطاس پر فرضی قصہ تخلیق ہونے لگا۔ ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء کو جب یہ قلم رکا تو بارِ خدا مکمل ہو چکا تھا۔ ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء سے لے کر ۱۳ مارچ ۲۰۰۶ء تک اس کہانی کو لکھتے ہوئے میں تنہائی میں کئی بار رویا ہوں۔ نہ جانے کیوں۔ بارِ خدا میرا پہلا ناول ہے۔ اب یہ ادنیٰ سی کوشش آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

محمد امین الدین

(۱)

یہ کہانی ہے زندگی کا کڑا عذاب سہنے والوں کی...... جو جہان دگر سے آئے...... اکھٹے ہوئے......اور ایک دوسرے کے دلوں میں اتر گئے......دھنک صبحیں...... چمکتی دوپہریں...... سنہری شامیں......اور خوابیدہ راتیں گزاریں۔ یہ ایک ڈور میں بندھے ہوئے تھے...... جس کے دونوں سروں پر قسمت نے گرہ لگائی ہوئی تھی...... یہ کہانی کچھ اس طرح سے شروع ہوتی ہے۔

بورڈنگ کی قطار میں کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف نوشین نے محب کو متوجہ کیا۔ محب نے بھی مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ بالکل گڑیا کی طرح۔ جسم متناسب، لمبی صراحی دار گردن جیسے باربی ڈول، آنکھیں گول مگر چمک دار، تراشیدہ ہونٹ، بغیر بازو کی سفید سلکی قمیص۔ وہ واقعی حسین گڑیا لگ رہی تھی۔ ریشمی بال اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے اور چہرے پر مہین سی

مسکراہٹ مستقل جمی ہوئی تھی۔اس کے ساتھ نوجوان بھی کچھ کم خوبصورت نہیں تھا۔نکلتا ہوا قد، چھریرا بدن، جوانی کی امنگوں بھرا متاثر کن انداز۔مردانہ وجاہت نے اس کی گوری رنگت اور تیکھے نقوش کو علیحدہ حسن دیا تھا۔دونوں کی عمریں بیس سے پچیس کے درمیان رہی ہونگی۔

نوشین نے آہستہ سے کہا۔

''دونوں کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔لگتا ہے نئی نئی شادی ہوئی ہے''۔

''پرانی تو میڈم آپ بھی نہیں ہیں۔البتہ یہ دونوں شاید حجلہ عروسی سے سیدھے اٹھ کر چلے آرہے ہیں''۔

قطار آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔دونوں اپنے بورڈنگ بنوا چکے تھے اور اب اپنا بیگ اٹھائے کوریڈور کی طرف جارہے تھے۔محبّ اور نوشین کا دھیان اب بھی ان دونوں کی طرف تھا۔شاید وہ ان دونوں میں خود کو تلاش کررہے تھے۔

ڈاکٹر محبّ اکبر اور ڈاکٹر نوشین کی شادی کو ایک سال ہوچلا تھا۔شادی کے بعد ان کا یہ پہلا سفر تھا۔دراصل شادی کے فوراً بعد محبّ کے والد ڈاکٹر اکبر کا انتقال ہوگیا۔جس کی وجہ سے یہ دونوں نہ کہیں جا سکے اور نہ شادی کو انجوائے کرسکے۔اب بھی دونوں کہیں جانا نہیں چاہتے تھے۔مگر محبّ کی امی بیگم ڈاکٹر رضیہ اکبر نے اپنی بہو کی توجہ بانٹنے کے لیے دونوں کو زبردستی شمالی علاقوں کی سیر کے لیے بھیجا تھا۔کیونکہ نوشین کے امی اور ابو کے درمیان کچھ دنوں سے تناؤ کی کیفیت تھی۔حتیٰ کہ نوبت طلاق تک آگئی۔بیگم رضیہ اکبر نے درمیان میں آکر معاملے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی لیکن نظر نہ آنے والی دراڑ کو پاٹنے میں ناکام رہیں۔تاہم دیرینہ تعلقات اور سنجیدہ کوششوں کا نتیجہ ضرور برآمد ہوا اور کشیدگی کسی حد تک کم ہوگئی۔لیکن جس طرح اچانک لگی ہوئی آگ کے اثرات تادیر باقی رہتے ہیں تناؤ اب بھی باقی تھا۔جس کا اثر انہوں نے اپنی بہو پر بھی پڑتے ہوئے محسوس کیا۔چنانچہ انہوں نے بیٹے اور بہو کو زبردستی تفریح کے لیے بھیج دیا۔

جہاز میں اتفاق سے انہیں جو نشستیں ملیں وہاں سے وہ خوبصورت نوجوان جوڑا سر نہواڑے سرگوشیاں کرتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دونوں انہیں دیکھ کر ایک بار پھر مسکرا دیے۔ ایئر ہوسٹس احتیاطی تدابیر کا ڈیمانسٹریشن کرنے لگی تو نوشین نے کہا۔

''یہ لوگ ہر پرواز میں راستوں کی نشاندہی، ماسک کے استعمال کا طریقہ اور نہ جانے کیا کیا بلاوجہ بتاتے ہیں۔ اب تو ہر شخص ان کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے''۔

''ایسا نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس پرواز سے کوئی ایک آدمی آج پہلی بار فضائی سفر کر رہا ہو''۔

''اٹس ویری سمپل، ایئر ہوسٹس اعلان کرتے وقت پوچھ لے کہ بھئی پہلی مرتبہ سفر کرنے والا مسافر ہاتھ اٹھا دے۔ جب نشاندہی ہو جائے تو صرف اسے بتا دیں اور بس''۔

''ہر کام کو کرنے کا ایک طریقہ اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اور یہاں یہی مناسب ہے۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ سمجھ لیں کہ ہم سب پہلی بار سفر کر رہے ہیں تو کیا برائی ہے۔ کچھ چیزوں کا دہراتے رہنا غیر ضروری نہیں بلکہ اچھا ہوتا ہے''۔

نوشین نے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا۔

''خیر چھوڑو۔ محبّ کیا ہم نے شادی کرنے میں زیادہ دیر نہیں کر دی؟''

''کیوں؟''

''ہمیں بھی اس ایج میں شادی کرنی چاہیے تھی''۔

نوشین نے نوجوان جوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم تو ان کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ ویسے ہمیں کوئی دیر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے میڈیکل کمپلیٹ کیے بغیر ہم شادی کیسے کر سکتے تھے۔ زندگی میں کچھ پانے کے لیے کچھ قربانی دینی پڑتی ہے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ یوں بھی اگر ہم نے اس ایج میں شادی کر لی ہوتی تو اب تک تم دو تین بچوں کی ماں بن گئی

ہوتیں''۔

''جوکہ میں ایک سال گزرنے کے باوجود نہ بن سکی''۔

''ایک ڈاکٹر کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں''۔

''کیوں! کیا ڈاکٹر مائیں نہیں بنتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہاری امی نے تمہیں کیوں پیدا کیا؟''

''تم ان لوگوں میں اتنا انٹریسٹ کیوں لے رہی ہو؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو پہلی ملاقات میں اچھے لگ جاتے ہیں''۔

''مگر ہماری تو ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی''۔

''ملاقات کے لیے ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کو جانا جائے یا تعارف حاصل کیا جائے''۔

''بالکل ضروری ہے۔ تم تو کلیہ ہی تبدیل کیے دے رہی ہو''۔

ہلکی پھلکی گفتگو پھر کھانا اور تھوڑی دیر اخبار کا مطالعہ اور یوں یہ سفر تمام ہوا۔ اسلام آباد کا موسم خوشگوار تھا۔ اکتوبر میں یہاں سردی کے آثار شروع ہوجاتے ہیں۔ کراچی سے آنے والوں کے لیے یہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار اثرات چھوڑتا ہے۔ سمندر کی نمی اور جسم میں پھیلی ہوئی نسوں اور اس میں دوڑتے خون کی طرح شہر کراچی کے جسم پر بکھری ہوئی سڑکوں کے جال پر دوڑتی ہوئی گاڑیوں کا دھواں اور دیگر آلودگی بھری فضا جب کہ یہاں کی فضا بہت مختلف تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ٹیکسی نے انہیں اسلام آباد کے پوش علاقے میں واقع نہال چچا کے گھر پہنچادیا۔

دراز قد بھرے جسم کے مالک ریٹائرڈ میجر نہال احمد اور بیگم نہال نے ان دونوں کا استقبال دروازے پر کیا۔ انہیں محبّ اور نوشین کے آنے کی خبر پہلے سے تھی۔ مگر کراچی سے چلتے ہوئے محبّ نے انہیں ایئرپورٹ نہ آنے کی درخواست کی تھی جو انہوں نے بچوں کی خوشی کی خاطر قبول

بھی کر لی۔ میجر صاحب محبّ کے سگے چچا نہ تھے بلکہ وہ محبّ کے والد ڈاکٹر اکبر کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔فوجی ڈسپلن اوراعلیٰ رکھ رکھاؤ کے مالک میجر صاحب کے دو بچے تھے۔ بیٹا جمال اور بہوراجی امریکہ میں رہائش پذیر تھےاور بیوہ بیٹی اپنے دوخوبصورت اور معصوم بچوں حرااور طلال کے ہمراہ اس بنگلے میں رہتی تھی۔

نفیسہ اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ جب محبّ کی شادی میں کراچی آئی تھی تو محبّ نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجودان دونوں بچوں کے ساتھ خوب وقت گزارا تھا۔وہ اپنے ڈیلی روٹین کے مطابق سمندر پر جاتا تو انہیں بھی ساتھ لے جاتا۔ وہ جب تک کراچی میں رہے محبّ کے ساتھ ہی لگے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ یہاں پہنچا تو وہ دونوں بھی نفیسہ کے ساتھ جاگتے ہوئے ملے۔محبّ نے سب سے پہلے اپنے بیگ کی جیب سے دو چاکلیٹ کے ڈبے نکال کرانہیں دیئے جو اس نے ایئرپورٹ پر خاص طور سے ان کے لیے خریدے تھے۔ چائے بناتے ہوئے نفیسہ نے نوشین سے پوچھا۔

’’بھابھی سفر کیسا رہا؟‘‘

نوشین کے جواب دینے سے پہلے محبّ نے کہا۔

’’باجی! نوشین آپ سے چھوٹی ہے۔اسے بھابھی نہ کہیں، نام سے پکاریں‘‘۔

’’بھئی میرے بھائی کی بیوی میری بھابھی ہوئی‘‘۔

نوشین نے جواب دیا۔

’’باجی آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ مجھے زیادہ اچھا لگے گا اگر آپ مجھے میرے نام سے پکاریں‘‘۔

’’ویسے تو ہمارے خاندان کی روایت ہے کہ بھائیوں کی بیویوں کو بہنیں بھابھی ہی کہتی ہیں‘‘۔

''اصل چیز رشتوں کا احترام ہے۔ اگر آپ کے اندر یہ احترام موجود ہے تو نام لے کر پکاریں یا کسی اور طریقے سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

بیگم نہال نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ میجر صاحب نے جو خاموشی سے چائے پی رہے تھے محبّ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''محبّ کراچی میں حالات کیسے ہیں؟ بلدیاتی الیکشن کی گہما گہمی تو اب ختم ہوگئی ہوگی''۔

''جی ہاں انکل! حالات خاصے پرسکون رہے۔ دراصل پچھلے ضمنی انتخابات کا تجربہ خاصا تلخ رہا تھا اس لیے خدشات بڑھے ہوئے تھے۔ بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے فوج کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ آ کر کنٹرول سنبھال لے۔ انکل آپ آرمی میں رہے ہیں، اس بارے میں مجھے آپ کے خیالات کا اندازہ نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر معاملے میں فوج کو دعوت دینا اب ٹھیک نہیں۔ ہم نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ ہر مسئلے کا حل فوج کے پاس ہے''۔

''بھئی یہ تو سول ایڈمنسٹریشن کا کام ہے کہ وہ اس تاثر کو ختم کرے''۔

''انکل سول ایڈمنسٹریشن کو کام کرنے دیا جائے گا تب نا۔ ہمارے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی اپنی مدت پوری نہیں کرتی۔ میں آپ کی قدر کرتا ہوں لیکن میرے اپنے جذبات ہیں۔ سیاست کی ناکامی میں سیاست دانوں کا قصور یقیناً ہوتا ہے مگر اتنا نہیں۔ اس میں یقینی طور پر فوج کی اقتدار کی خواہش بھی شامل رہتی ہے''۔

''فوج کا اپنا ڈسپلن ہے اور فوج اپنے اس ڈسپلن سے باہر کبھی نہیں نکلتی۔ لیکن ایک بات جو اس وقت تمہارے سامنے اپنی پرسنل کیپیسٹی میں کہہ رہا ہوں کہ اگر پاکستان میں کوئی ادارہ پاکستان سے وفادار ہے تو وہ صرف فوج ہے''۔

اس دوران تینوں خواتین نے جب محسوس کیا کہ گفتگو ان کے لیے غیر ضروری ہوگئی ہے تو وہ اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئیں اور اپنا پسندیدہ موضوع یعنی خواتین کی سماجیات کو گفتگو کا حصہ بنالیا۔

محبّ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا مطلب باقی سب غدار ہیں؟''

''یہ لفظ زیادہ شدید ہو جائے گا۔ ہم یہاں مشکوک کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ اور یہ میرا ذاتی خیال ہے''۔

''انکل میں نہیں مانتا۔ میں آپ کی بات کو ڈس اگیری کرتا ہوں۔ جمہوریت سے بہتر دنیا میں کوئی نظام نہیں۔ اور جمہوریت میں صرف عوام کا رول ہوتا ہے فوج کا نہیں۔ جبکہ پاکستان میں جمہوریت کو نہ پنپنے دیا گیا اور نہ ہی اسے مستقل جاری رکھا گیا۔ جب بھی اس نے قدم جمانے کی کوشش کی کسی جانب سے اسے کمزور کر دیا گیا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا زیادہ تر فائدہ فوج نے حاصل کیا''۔

''بیٹے پہلے یہ دیکھو کہ تم جسے جمہوریت سمجھ رہے ہو وہ صحیح معنوں میں جمہوریت ہے بھی کہ نہیں''۔

''آپ کا مطلب ہے پاکستان میں کبھی جمہوریت نہیں رہی؟''

''انتخابات اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی حکومت، ایک وزیراعظم اور وزیروں مشیروں کی ختم نہ ہونے والی لمبی قطار، شاید تم اسے جمہوریت سمجھتے ہو۔ جس میں اسمبلی کا ہر ممبر کسی نہ کسی حوالے سے اپنا فیوڈل بیک گراؤنڈ رکھتا ہے''۔

''ایسی جمہوریت کو تو میں بھی ناپسند کرتا ہوں مگر کیا کریں مجبوری ہے۔ ہمیں سسٹم کی خرابی کو دور کرنا ہے نہ کہ سسٹم ہی کو ختم کر دیں۔ فوج اس کو پنپنے تو دے''۔

''محبّ! فوج نے کسی کے ہاتھ نہیں روکے۔ عوام ملک میں حقیقی تبدیلی لے کر آئیں اور مخلص ہو کر ملک کی بقا اور سلامتی کے لیے کام کریں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ فوج کبھی نہیں آئے گی''۔

''انکل ہم نے ہر کام کی اتھارٹی فوج کو سمجھ رکھا ہے۔ بھل صفائی ہو تو فوج کرے گی۔ لوکل گورنمنٹ کا آئین بنوانا ہو تو فوج بنائے گی۔ این آر بی چلوانا ہو تو فوج چلائے گی۔ نیب چلانا ہو تو فوج چلائے گی۔ انتظامی معاملات ہوں تو فوج کی طرف دیکھا جاتا ہے۔ اداروں کی سربراہی ہو تو فوج کرے گی۔ ہم نے ہر مرض کی دوا کو جب فوج ہی سمجھ رکھا ہے تو پھر ادارے مضبوط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''تمہارے جذبات بالکل بجا ہیں۔ ابھی جو تم نے بہت سارے کام گنوائے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جن میں فوج کا واقعی کوئی تجربہ نہیں ہے۔ فوج کی اپنی ایک الگ ٹریننگ ہوتی ہے اس کا اپنا علیحدہ ویژن ہوتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں اس طرح کے مسائل تو ہیں''۔

''انکل بھارت بھی تو تیسری دنیا کا ملک ہے۔ وہاں اقتدار میں فوج کبھی نہیں آئی۔ وہاں بے شمار علیحدگی کی تحریکوں نے سر اٹھایا، کتنے موقعوں پر وزیراعظم کو مار دیا گیا۔ کئی بار اتحاد ٹوٹے اور ملک میں انارکی پھیلی مگر فوج نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ بلکہ نظام کو چلنے دیا''۔

''اس کے پیچھے بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو آزادی کے فوراً بعد ان کے پاس کام کرنے کے لیے ادارے پہلے سے موجود تھے جو ہمارے ہاں نہیں تھے۔ دوئم انہوں نے شروع ہی میں راجہ مہاراجاؤں سے راج پاٹ چھین لیے۔ انہیں دکھانے کا پروٹوکول دے دیا گیا۔ خرچہ مقرر کر دیا گیا اور بس۔ دوسری طرف جاگیردارانہ نظام پر ضرب لگائی جس کی وجہ سے ان کے ہاں سیاست میں عام آدمی آگے آیا۔ جبکہ ہمارے یہاں شروع ہی میں اس کے اُلٹ ہوا۔ اول تو پاکستان کی بانی جماعت میں جتنے بڑے بڑے لیڈر تھے سب نواب، وڈیرے، چوہدری اور سردار تھے۔ انہوں نے اصلاحات ہونے نہیں دیں۔ بلکہ خود کو پہلے سے زیادہ مضبوط کیا اور اپنی اولادوں کو سیاست میں لے آئے''۔

''یہ بات آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اٹھاون سال گزرنے کے بعد آج ہم جب بہت

سارے سیاستدانوں کا شجرہ نسب پڑھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ سب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ پود ہے جو سیاست کو اپنی جاگیر سمجھ کر پنجے گاڑے بیٹھی ہے۔ لیکن انکل! ایک بات اور بھی ہوئی۔ پاکستان کے پہلے پچیس سالوں میں فوج کے عمل دخل، مارشل لاء اور ان کے اثرات کو ان موروثی سیاستدانوں نے خوب اچھی طرح پڑھ لیا۔ لہٰذا انہوں نے نہایت چالاکی سے فوج کے بڑے بڑے افسروں سے اپنے روابط بڑھائے، ان کے ساتھ رشتہ داریاں کیں، کہیں کسی بڑے فوجی کو یا اس کے بیٹے کو اپنا داماد بنایا تو کہیں وہ خود یا ان کا بیٹا داماد بن گئے۔ اگلے پچیس سالوں میں تو یہ رشتے اور مضبوط ہو گئے ہیں''۔

''ہاں یہ تو ہوا ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس تجربے سے میں خود بھی گزرا ہوں۔ نفیسہ کا مرحوم شوہر صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کا بیٹا ہی تھا۔ بہت نیک اور شریف انسان تھا۔ افسوس! ہمارے ہاں کی انتقامی سیاست کی نذر ہو گیا''۔

یہ کہتے ہوئے میجر صاحب کی آواز بھرّا گئی اور وہ کچھ اُداس اُداس سے نظر آنے لگے۔ محب اس پورے پس منظر سے واقف تھا۔ وہ خود افسوس کرنے لگا کہ اس نے بات کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ میجر انکل خود اپنی اکلوتی بیٹی کو ایک مقامی سیاست دان کے بیٹے سے بیاہ چکے ہیں۔ چند سال پہلے اسلام آباد اور لاہور کے بیچ ویرانے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دہشت گردوں نے کار میں سوار اشفاق چوہدری اور اس کے سیکریٹری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

محب اس پوری صورتحال سے آگاہ تھا۔ اس کی اشفاق چوہدری کے ساتھ کچھ یادگار ملاقاتیں رہی تھیں۔ وہ اشفاق کی شخصیت اور اس میں چھپے ہوئے نیک دل انسان کو پسند کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اشفاق کی ناگہانی موت کو اس نے نہایت کرب سے محسوس کیا تھا۔ اور آج باتوں باتوں میں جب اس نے غلطی سے سیاستدانوں اور فوج کے گٹھ جوڑ کا بے خیالی میں ذکر کیا تو وہ بھول گیا۔ نفیسہ اور اشفاق کا رشتہ صرف سیاسی بندھن کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ وہ کالج کے زمانے سے

ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ان دونوں کے درمیان محبت کسی گملے میں احتیاط سے لگائی کروٹن کی طرح نہ تھی بلکہ وہ تو جنگل میں اگ آنے والی خودرو جھاڑیوں کی طرح پروان چڑھی تھی۔بس وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے ان جھاڑیوں کو زمین میں جمی ہوئی جڑوں سے جدا کر کے ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ہاں یہ ضرور ہوا کہ سب کچھ بکھرنے سے پہلے ان کی محبت کے دو پھول کھل اٹھے جو طلال اور حرا کی شکل میں نفیسہ کے آنگن میں چہکتے مہکتے دکھائی دیتے تھے۔

محبّ کو جیسے ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ فوراً بولا۔

''انکل! سوری میں نے آپ کو دکھی کر دیا''۔

''نو نو اٹس آل رائٹ''

میجر صاحب نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے موضوع کو بدل دیا اور گفتگو میں اس بات کا ذکر لے آئے جس کے بارے میں وہ چند روز سے سوچتے رہے تھے۔اور جب محبّ اور نوشین کے کراچی سے آنے کی اطلاع ملی تو وہ تب سے اپنے دل میں ایک ارادہ کیے بیٹھے تھے جس کا ذکر وہ محبّ سے کرنا چاہتے تھے۔وہ بولے۔

''محبّ میں تم سے نفیسہ کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں''۔

''جی انکل''۔

محبّ نے موضوع کی تبدیلی میں عافیت جانی اور پوری توجہ کے ساتھ بولا۔میجر صاحب نے بغیر تمہید باندھے کہا۔

''آرمی کے ایک کیپٹن نے نفیسہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی ہے۔نفیسہ سے اس کی امی نے پوچھا تو اس نے شادی سے انکار کر دیا''۔

''کیا شادی کی خواہش کیپٹن صاحب نے خود کی ہے؟''

''ہاں! اتفاق سے آرمی کالج میں وہ میرے شاگردوں میں تھا۔آج کل مظفر آباد میں

تعینات ہے۔ وہ نفیسہ سے شادی کی خواہش لے کر خود یہاں آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ نفیسہ کو کیسے جانتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ نفیسہ بیوہ ہے اور دو بچوں کی ماں بھی۔ مجھے اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی''۔

میجر نہال نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اب مسئلہ یہ ہے کہ نفیسہ کو کیسے قائل کیا جائے کہ شادی کر کے وہ اس سے بھی زیادہ سکھ میں رہے گی جتنی ابھی رہ رہی ہے۔ تم لوگ یہاں مری سوات وغیرہ گھومنے کے لیے آئے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کرلو۔ نفیسہ، طلال اور حرا کو ساتھ لو اور آزاد کشمیر کی طرف نکل جاؤ۔ مظفر آباد اور اس کے آس پاس کے علاقے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں کیپٹن زبیر کی مہمان نوازی کو انجوائے کرو۔ بیٹا! میں یہ سب باتیں تم سے بہت اسٹیٹ فارورڈ کر رہا ہوں۔ بظاہر بہت عجیب سا لگتا ہے کہ نفیسہ وہاں جائے اور زبیر سے ملے۔ لیکن نفیسہ کو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ اور یہی وقت ہے کہ ابھی فیصلہ کرلیا جائے ورنہ وقت تو بہتے دریا کی طرح ہے کہ گزر گیا تو پھر ہاتھ نہیں آتا''۔

''انکل مجھے خوشی ہورہی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔ میں آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔ باجی کو میں ضرور ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ویسے بھی میں اور نوشین تو خود بھی کشمیر دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں''۔

''چلو پھر ٹھیک ہے تم لوگ پروگرام بنالو''۔

اتنی دیر میں خواتین نے کچھ ہلکے پھلکے کھانے کا انتظام کرلیا تھا سب ڈائننگ ٹیبل کی سمت چل دیئے۔

(۲)

گاڑی بل کھاتی سڑک پر تیزی سے رواں دواں تھی۔ سبک رفتاری سے صاف عیاں تھا کہ ڈرائیور ان دشوار اور پر پیچ راستوں پر سفر کرنے کا عادی ہے۔ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ محب، نوشین، نفیسہ اور دونوں بچے تیزی سے گزرتے ہوئے بلند و بالا سرسبز پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ کار میں سواران مسافروں کی منزل مری اور اس کے آس پاس کے علاقے تھے۔ رات کھانے کے بعد میجر صاحب اور دونوں چھوٹے بچے جب سونے چلے گئے تو یہ چار کا ٹولہ رات گئے تک باتیں کرنے کے لیے لاؤنج میں براجمان ہو گیا۔ اس دوران جب چند لمحوں کی تنہائی میسر آئی تو محب نے نوشین کو میجر انکل کی خواہش سے آگاہ کیا۔ نوشین نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی اور یہ بھی طے کیا کہ صبح ہم مری چلتے ہیں اور وہیں باجی کو مظفر آباد کے لیے راضی کریں گے۔

ایک گھنٹے بعد وہ مری کے مال روڈ پر تھے۔ بازار میں چہل پہل جاری تھی۔ موسم خوشگوار اور

سڑکیں گیلی تھیں جس سے پتا چل رہا تھا کہ رات بارش ہوئی ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی جی پی او کے دائیں جانب والی گلی میں لے جا کر پارک کر دی۔ مال روڈ پر دھیمی دھیمی چال سے پیدل چلتے ہوئے نوشین نے محب کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا۔ محب سمجھ گیا۔ وہ بولا۔

''اب مری گھومنے پھرنے کی جگہ نہیں رہی۔ بازار ہی بازار بنتا جا رہا ہے۔ ان بڑی بڑی عمارتوں کے تعمیر ہونے سے قدرتی حسن اور اس کا مخصوص طرزِ حیات متاثر ہو رہا ہے''۔

نفیسہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف مال روڈ اور بس اڈے تک کا حال ہے۔ باقی سارا مری ویسا ہی ہے۔ اپنے قدرتی حسن سے مالا مال۔ بھوربن، پتریاٹا، نتھیا گلی جہاں چاہو وہاں نکل جاؤ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ پنڈی اور کشمیر پوائنٹ سے دکھائی دینے والا نظارہ ویسا ہی ملے گا جیسا تم پہلے کبھی دیکھ کر گئے ہو۔ کشمیر پوائنٹ سے آزاد کشمیر کے برف پوش پہاڑ بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں، ویسے ہی بادل پہاڑوں کو چھوتے ہوئے گزرتے ہیں، ویسے ہی پہاڑ آسمانوں سے سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں''۔

''کشمیر کے پہاڑوں کو یہاں سے دیکھنے کا کیا فائدہ۔ اگر دیکھنا ہی ہے تو بندہ وہیں جا کر دیکھے''۔

''چلو پھر ایسا کرتے ہیں کہ کشمیر ہی چلتے ہیں''۔

محب نے فوراً بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ نفیسہ لمحہ بھر کو چونکی۔ پھر دوسرے ہی لمحے نہایت معصومیت سے بولی۔

''تم دونوں کے لیے اچھا ہے، نئی جگہ ہوگی زیادہ مزا آئے گا''۔

''ہم دونوں کے لیے نہیں بلکہ ہم سب کے لیے''۔

''کیا مطلب؟''

"اگر آزاد کشمیر جائیں گے تو ہم سب جائیں گے۔ یہ بچے بھی"۔

محبّ نے نہایت شوخی سے حرا کو گود میں لیتے ہوئے مزید کہا۔

"کیوں حرا بچے بھی تو مظفر آباد جاتے ہیں نا؟"

حرا نے ننھی ہتھیلی بھرے پوپ کارن منہ میں رکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

"یہ مظفر آباد کیوں کہا تم نے؟"

نفیسہ نے پوچھا تو محبّ نے جواب دیا۔

"مظفر آباد کا مطلب آزاد کشمیر اور آزاد کشمیر کا مطلب **مظفر آباد**"

"مجھے تمہاری باتوں سے کچھ بو آ رہی ہے"۔

اب محبّ اور نوشین سنجیدہ ہو گئے۔ دونوں بل کھاتی ہوئی سڑک پر گہری کھائی کی جانب سمنٹ کی بنی مضبوط ریلنگ کا سہارا لے کر دور دور تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کا نظارہ کرنے لگے۔ نفیسہ اور دونوں بچے بھی قریب آ گئے۔ نوشین بولی۔

"دیکھیں فضا میں کیسی خوشبو بکھری ہوئی ہے۔ اور آپ کہہ رہی ہیں کہ بو آ رہی ہے"۔

"بات کو مذاق میں مت اڑاؤ۔ تم لوگ گھومنے پھرنے آئے ہو۔ جی چاہے تو سوات جاؤ ناران کاغان جاؤ، اکیلے گھومو پھرو انجوائے کرو۔ میں تم لوگوں کے ساتھ مری آ گئی......کافی ہے۔ نا بابا نا...... میں کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہتی وہ بھی کسی ہنی مون جوڑے کے بیچ...... نو......نیور......"

"اول تو آپ ہماری اس تفریح کو ہنی مون کا نام نہ دیں۔ دوئم میں اور نوشین آپ سے کھل کر بات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے آپ صرف ایک سوال کا جواب دیں۔ کیا آنٹی اور انکل کی یہ معصوم خواہش جائز نہیں ہے کہ وہ آپ کو دوبارہ اپنے ہنستے بستے گھر میں دیکھیں؟"

"محبّ تم تو اتنی لمبی جست لگا کر بات کے آخری نقطے پر آ گئے اور ڈائریکٹ کہہ رہے ہو

کہ......"

نفیسہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نفیسہ جانتی تھی کہ محبّ اس سے کتنا پیار کرتا ہے۔ بالکل ایک چھوٹے بھائی کی طرح۔ گو کہ نفیسہ اور محبّ کی عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ لیکن محبّ بچپن ہی سے نفیسہ کو باجی کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ رشتوں کے اس احترام کی وجہ سے محبّ نے اپنے لیے ایک خود ساختہ لکیر کھینچ رکھی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ دونوں جب کبھی ملتے تو زندگی کے ہر موضوع کی ڈور کو پکڑتے۔ نفیسہ کی جب شادی ہوئی تو اس بحث برائے بحث میں اشفاق بھی شامل ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی بیوی نفیسہ کے بجائے محبّ کا ساتھ دیا کرتا۔ ایسے موقعوں پر اکثر نفیسہ اپنے شوہر سے پوچھتی کہ آپ کی شادی مجھ سے ہوئی ہے یا محبّ سے۔ پیار کے یہ رنگ اور محبت کے یہ گلاب اچانک کُملا گئے جب گولیوں کا ایک برسٹ اشفاق کے سینے اور گردن کے پار اتر گیا۔

اس دن نفیسہ محبّ کے سینے پر سر رکھ کر بہت روئی تھی۔ رشتوں کی یہ ڈور سگی نہ ہونے کے باوجود بہت مضبوط تھی۔ جس میں خلوص اور اپنایت اور احترام کی یکجائی نے انمٹ نقوش قائم کیے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نفیسہ نے اس جملے پر خوش گوار حیرت کا اظہار کیا تھا۔

نفیسہ اس موضوع پر اپنے امی پاپا سے خاصی طویل بحث کر چکی تھی۔ وہ اس سوال کہ کیا آپ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں سے لے کر اس جواب تک کہ میں اپنے دونوں بچوں کو خود بھی پال سکتی ہوں تک سارے سوال و جواب کر چکی تھی۔ وہ زندگی بھر اپنے امی پاپا سے اپنی ہر بات منواتی آئی تھی۔ لیکن آج میجر صاحب کو یقین تھا کہ اب اس بار وہ نفیسہ سے اپنی بات منوا کر رہیں گے۔ وہ نفیسہ اور محبّ کی آپس میں لمبی لمبی بحثیں کرنے کی عادت سے واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کئی بار محبّ نے نفیسہ سے اپنی بات منوائی ہے۔ لہٰذا انہیں یہ پورا یقین تھا کہ محبّ اس میں ضرور کامیاب ہوگا۔

مال روڈ سے پنڈی پوائنٹ اور پھر شام کو کشمیر پوائنٹ کی طرف چہل قدمی کرتے ہوئے یہ

دونوں اور نوشین نے ایک دوسرے کو دلائل سے قائل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ وہ اپنی بحث میں اس قدر محو تھے کہ اگر کوئی ان سے دوران مٹرگشت پوچھتا کہ اس وقت آپ کس مقام پر ہیں تو وہ انہیں یاد بھی نہ ہوتا کہ کب کہاں سے گزرے اور کہاں پہنچے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں مری آنا کوئی تفریحی کا باعث نہ تھا بلکہ نفیسہ کو اپنے ساتھ مظفرآباد لے جانے کے لیے قائل کرنے کی ایک کوشش تھی جو کہ ایسی سعی لاحاصل بھی نہ تھی۔

ایسے ہی ایک موقع پر نوشین نے نفیسہ کو قائل کرنے کے لیے کہا۔

''باجی! آپ سے کوئی ضد نہیں ہے کہ آپ شادی کریں نہ کریں یہ تو بعد کی بات ہے۔ لیکن کیا اس شریف آدمی سے ملنے میں کوئی قباحت ہے؟''

''یہ کیا بات ہوئی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ ہم ایک شخص کو جانتے تک نہیں اور جا کر اس کے گھر مہمان بن جائیں۔ میں اس طرح کسی کی مہمان نہیں بن سکتی''۔

''چلیں ان کے مہمان نہیں بنتے۔ ہم وہاں کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔ ہم آپ کی بات مان رہے ہیں۔ آپ ہماری بات مان لیجئے۔ بلکہ یوں کہیں کہ ہم گھومنے پھرنے جارہے ہیں۔ اگر وہاں ہماری ملاقات کیپٹن صاحب سے ہوئی تو مل لیں گے۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزار لیں گے، ورنہ ہم مظفرآباد کی وادیوں، وہاں کے جھرنوں آبشاروں اور یخ بستہ دریاؤں کا نظارہ کریں گے، لطف اٹھائیں گے اور واپس آجائیں گے......دیٹس آل''۔

نفیسہ کے پاس اب انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ خاموش ہوگئی۔ نوشین نے اس خاموشی کو نیم رضامندی سے تعبیر کیا اور کہا۔

''چلیں طے ہوگیا۔ ایسا کرتے ہیں کہ یہیں سے مظفرآباد کی طرف نکل پڑتے ہیں''۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں''

محب نے تائید کی تو نفیسہ نے دونوں کو گھورا اور کہا۔

Scanned by CamScanner

ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ یہ کوئی اسلام آباد سے مری کا سفر ہے کہ صبح ہی صبح منہ اٹھایا اور چلے آئے اور شام کو دوبارہ اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ گئے۔ پہلے گھر چلتے ہیں اور پھر کل وہاں سے تیاری کے ساتھ نکلیں گے۔ بچوں کے کپڑے اور نہ جانے کیا کیا لینا پڑے گا۔ دوئم ہم مظفرآباد اپنی گاڑی میں سے نہیں جائیں گے۔ بس سے چلیں گے"۔

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی"۔

محب نے کندھے اچکاتے ہوئے مزید کہا۔

"ہمیں صبح سے شام ہوگئی مری کی سڑکیں ناپتے ہوئے۔ ہم مری کس لیے آئے تھے؟"

"مجھے ان پہاڑیوں سے دھکا دینے کے لیے"۔

نفیسہ کے جواب پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ سب مری کی پر پیچ اترائیوں سے گھر لوٹ رہے تھے۔

(۳)

مسافروں سے بھری ایئر کنڈیشنڈ بس نے خوبصورت موڑ کاٹا تو کوہ ہمالیہ کے پہاڑی سلسلوں کے درمیان بنا ہوا پل اچانک سامنے آ گیا۔ یہ کوہالہ پل تھا جسے عبور کرنے کا مطلب دو ملکوں کے درمیان کی سرحد کو عبور کرنا تھا۔ اس پل کے بعد آزاد کشمیر کا خطہ شروع ہو جاتا تھا۔

آزاد کشمیر۔

جنت نظیر، فلک بوس چوٹیوں کے سرزمین مسحور کن چشموں، گنگناتے آبشاروں اور شور مچاتے دریاؤں کی زمین۔

کہیں بہادر جوانوں کے سروں پر تنے ہوئے کلاہ اور کہیں بزرگوں، عمر رسیدہ کمر کی طرح جھکے ہوئے پہاڑوں کی زمین۔

ایسی سرزمین جس پر نظر جھکا کر دیکھو تو گہری کھائیوں کے درمیان شفاف نیلگوں چھلانگیں

مارتا ہوا یخ پانی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور جب نظر اٹھا کر دیکھو تو ہر سمت سر اٹھائے سبزے، چیڑ اور دیودار کے بلند و بالا درختوں سے لدے ہوئے پہاڑ دماغ کی بلند ترین سطحوں کو چھو لیتے ہیں۔ دل و دماغ پر اثر ڈالتی ہوئی یہ سرزمین اپنے چپے چپے پر طلسماتی جوبن لیے اپنی حسین بانہیں پھیلائے ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتی ہے۔

اس خطے کی داستان کم طلسماتی نہیں۔ اگر دنیا کے نقشے پر موجود اس خطے کو غور سے دیکھیں تو جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے یہ خطہ بڑی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ اس کی انفرادیت آج کے دور کے ملکوں، ان کی حد بندیوں اور دفاعی حوالے سے یقیناً اہمیت کی حامل رہی ہے۔ لیکن یہ سرزمین صدیوں پہلے بھی کئی حوالوں سے توجہ کا خاص مرکز رہی ہے۔ ایک زمانے میں مختلف ادوار کی تاریخ اکٹھی کرنے یا اس پر تحقیق کرنے کے لیے مورخین جب شمالی ایشیا آیا کرتے تو وہ اس خطے سے ہی گزر کر جاتے۔ یا تہذیبوں کے تانے بانے جوڑنے کے لیے یہاں ضرور آتے۔ کیونکہ اس جنت نظیر علاقے کو دیکھے بغیر یہاں کے بارے میں درست تجزیہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی صورت حال سیاحوں کے ساتھ بھی رہی۔ شمالی ایشیا میں قدرت کی کاریگری دیکھنے کی خواہش رکھنے والے سیاح کشمیر کے سحر میں ہمیشہ مبتلا رہے ہیں۔

صدیوں سے چک خاندان کا چکڑی بیگ سوا تین سو سال پہلے بمبا شاہی خاندان کے سربراہ سلطان مظفر خان کے دور میں مظفر آباد کے نام سے باقاعدہ ایک شہر کی صورت آباد ہوا۔ پہاڑوں، وادیوں اور ہموار خطوں پر بکھرے ہوئے سینکڑوں گاؤں، قصبوں، پر مشتمل ضلع مظفر آباد تقسیم سے پہلے پورے شمالی علاقے کا سب سے بڑا ضلع سمجھا جاتا تھا۔ یہ ضلع اپنے قدرتی مناظر پہاڑوں، سرسبز وادیوں، خشک میوہ جات، حسین پھولوں، قدرتی جڑی بوٹیوں، قیمتی معدنیات، وادی نیلم کے قیمتی یاقوت و نیلم، نایاب لکڑی، پہاڑی چشموں، خوبصورت آبشاروں، یخ بستہ جہلم اور نیلم دریاؤں، غذائی اجناس، پہاڑی گزرگاہوں، دریائے نیلم کے دونوں کناروں پر بلند ہوتی

ہوئی پہاڑی چٹانوں پر سر اٹھائے قلعوں اور دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتی برف پوش وادیوں کی وجہ سے دنیا کے ایسے بہترین مقامات میں سے ایک ہے جسے انسانی آنکھ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ تقسیم کے بعد اپنے قدرتی حسن سے مالا مال یہ جنت نظیر وادی اتنی ہی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ مگر یہ بات اب بھی حیرت انگیز ہے کہ جدید دور کی بے شمار سہولیات، مشینوں دیوہیکل گاڑیوں، مواصلاتی و برقیاتی نظام کے باوجود یہاں پر بسنے والے لوگ بہت سادہ اور دیہاتی ہیں۔ اپنے خاندانی رسم و رواج، اپنی تہذیب اور طرز زندگی سے جڑے ہوئے یہ لوگ سیاحوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت جنگلات کے بعد یہاں کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی ہے۔

مظفرآباد کی ایک نسبت بزرگان دین کے حوالے سے بھی ہے۔ سخی سہیلی سرکار، شاہ عنایت ولی، دھنی مائی اور صوفی پیر چناسی یہاں کے ایسے بزرگان دین ہیں جن سے یہاں کے لوگ خصوصی عقیدت رکھتے ہیں۔ راہ سلوک کے ان صوفیاء سے ملنے ان کی حیات میں بھی دشوار گزار پہاڑی سلسلوں سے گزر کر لوگ آیا کرتے تھے۔ اور بعد حیات یہ عقیدت اور بھی مسلّم ہو چلی ہے۔ اب اس عقیدت، محبت اور احترام میں آنے والے اجنبی سیاح بھی شامل ہو گئے ہیں۔

مظفرآباد کا موسم بھی عجب آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ پل بھر میں دھوپ چمکنے لگتی ہے اور پل بھر میں بادل سایہ کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا پہاڑی راستوں سے جب وادی کی گہری کھائیوں میں جھانکو تو تیرتے ہوئے بادل انسانی قد سے نیچے اتر آتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے لیے گردن اُٹھانی نہیں جھکانی پڑتی ہے۔ پہاڑی راستوں پر پہلی بار آنے والے اجنبی سیاحوں کے لیے یہ منظر حیرت انگیز دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ بس میں بیٹھے ہوئے مسافر شیشوں کے پار مسلسل آنکھیں گاڑھے لمحوں میں بدلتی ہوئی دنیا کو سحر کے عالم میں دیکھتے۔ ابھی مسافروں کے دائیں طرف بلند چوٹی اور بائیں طرف گہری کھائی اور اس میں دریائے نیلم کا پرشور ماحول، شفاف فضا اور سورج کی کرنیں دریا میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ چند دشوار موڑ کاٹنے کے بعد بس دو پہاڑوں کے

درمیان کھائی سے گزرتی دوسری سمت جانکلتی ہے۔ سارا منظر لمحوں میں تبدیل ہوگیا۔ اب پہاڑی چوٹی بائیں اور گہری کھائی دائیں طرف ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہیں۔ جہاں اوپر پہاڑ کی چڑھائی اور نیچے گھاٹیوں کی ڈھلوان پر جا بجا بے ترتیب بنے ہوئے چھوٹے بڑے نیم پختہ مکان دکھائی دیتے ہیں۔ جن میں زندگی کی رمق کا احساس ہر جا موجود ہے۔ کہیں مکانوں سے اٹھتے ہوئے دھویں کی شکل میں کہیں آس پاس بندھے ہوئے گائے بیل کی صورت میں، کہیں دوڑتی بھاگتی اچھلتی کودتی بکریوں کے روپ میں تو کہیں پہاڑوں پر بنے تہہ دار کھیتوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کی اداؤں میں۔

اجنبی مسافروں کا یہ حیرت بھرا احساس اپنی جگہ درست ہے کہ یہ لوگ یہاں ڈھلوانوں پر کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جو یہاں کی زندگی سے اجنبی نہیں وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ ان وادیوں میں بسنے والوں کو ان پہاڑوں سے کیسی محبت ہے۔ یہ کسی دولت مند کی شاندار حویلی کے وسیع و عریض لاؤنج میں دائرے کی صورت گھومتی ہوئی سیڑھیوں پر احساس تفاوت کے ساتھ چڑھنے اترنے سے کہیں زیادہ اپنائیت رکھتا ہے کہ یہاں قدم قدم پر قدرت کی عطا اور کاریگری کا احساس بکھرا ہوا ملتا ہے۔

ابھی مسافر اس سحر سے باہر نہیں نکل پاتے کہ انہیں دوسرا احساس جکڑ لیتا ہے۔ یہ موسم کے تبدیل ہونے کا احساس ہے۔ گھاٹی سے پہلے دریائے نیلم کا پرشور ماحول، شفاف فضا اور سورج کی کرنیں دریا میں اترتی ہوئی اب محسوس نہیں ہو رہی ہیں۔ فضا میں تیرتے ہوئے بادلوں کے دائرے مرغولے بنتی بگڑتی تصویروں کے ساتھ آ موجود ہیں۔ سورج کی کرنیں بادلوں کے پیچھے ہیں اور دور دور تک پھیلے سبزے پر بادلوں کے سائے نے سبزے کا رنگ گہرا کر دیا ہے۔ اچانک محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں پر جمی عینک پر کس نے پانی پھینک دیا ہو۔ مگر آنکھوں پر عینک نہ ہونے کا خیال خوشگوار احساس میں تبدیل ہونے لگتا ہے کہ یہ پانی بس کے شیشوں پر گر رہا ہے۔ بادلوں نے

مسافروں کا استقبال پھوار کی صورت میں کیا ہے۔ رفتہ رفتہ پھوار تیز بارش میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

ڈرائیور نے بس کی رفتار سست کردی۔

مسافر ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ کیونکہ فضا کا یہ خوشگوار احساس روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہونے لگا ہے۔ نوشین کی نگاہیں بھی شیشے کے پار دور تک پھیلے ہوئے سبزے پر گڑی ہوئی ہیں۔ وہ قدم قدم پر تحسین آمیز جملوں سے محبت کو متوجہ کرتی رہی ہے۔ کیونکہ ان پہاڑوں کے درمیان وہ پہلی بار سفر کر رہی تھی اور سنے ہوئے قصوں کو خود محسوس کرنے کے عمل سے گزر رہی تھی۔

رفتہ رفتہ پہاڑی راستے قدرے ہموار راستوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف بنے مکانات اور دکانوں کی قطار سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ مظفر آباد قریب آ رہا ہے۔

(۴)

مسافروں کے پہنچنے سے پہلے ان کے آنے کی خبر مظفرآباد پہنچ چکی تھی۔میجر صاحب نے صبح ہی کیپٹن زبیر کو محبّ،نوشین،نفیسہ اور دونوں بچوں کے آنے کی اطلاع کردی تھی۔بس اڈے پر سرکاری گاڑی سمیت ڈرائیور پہلے سے ان لوگوں کو لے جانے کے لیے موجود تھا۔نفیسہ کے لیے یہ غیر متوقع تھا۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پاپا کیپٹن زبیر کو یوں اطلاع کر دیں گے۔باوردی ڈرائیور کو بس سے اترنے والے مسافروں میں ایک شہری مرد، دوشہری عورتیں اور دو بچے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔اس نے قریب آ کر پوچھا۔

''سرآپ ڈاکٹر محبّ ہیں؟''

''جی ہاں''

''سر مجھے کیپٹن زبیر صاحب نے آپ لوگوں کو لینے کے لیے بھیجا ہے''۔

''کیوں بھیجا ہے؟''

نفیسہ نے تڑاخ سے پوچھا۔ ڈرائیور لمحہ بھر کو سٹپٹا گیا۔ مگر محبّ کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر اس جملے کو محض مذاق سمجھتے ہوئے سامان اٹھانے میں مصروف ہو گیا۔ ڈرائیور کے ردِ عمل پر نفیسہ سے کچھ اور نہ بن پڑا تو وہ غصّے سے بولی۔

''آپ کی بڑی مہربانی آپ یہاں آئے۔ آپ ہمیں یہاں کے کسی اچھے اور پرسکون ہوٹل میں پہنچا دیں۔''

محبّ نے سامان اٹھانے میں مدد کرتے ہوئے کہا۔

''اب کوئی اتنی محبت سے ہماری مہمان نوازی کرنا چاہتا ہے تو ہمیں بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی پیش کش کو قبول کر لینا چاہیے''۔

''کل یہ پرامس ہوا تھا کہ ہم ہوٹل میں قیام کریں گے''۔

''میں اب بھی اس پر قائم ہوں۔ مگر یہ انتظام اور یہ اطلاع میری طرف سے نہیں ہے۔ کیپٹن زبیر سے میں بھی اتنا ہی اجنبی ہوں جتنا آپ۔ ہماری اسلام آباد سے روانگی کے بعد انکل نے زبیر صاحب کو اطلاع کر دی کہ ہم آ رہے ہیں۔ اور جب انکل انہیں یہ بتا چکے ہیں اور وہ خود بھی ہمیں اپنا مہمان بنانا چاہتے ہیں تو اب یہ غیر اخلاقی سا لگ رہا ہے کہ ہم یہاں ہوٹل میں قیام کریں''۔

نوشین جو موجودہ صورت حال پر اب تک مسکرا رہی تھی نے نفیسہ کے قریب آتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''باجی آپ کچھ بری میچور باتوں کو خود سے رجسٹرڈ کر رہی ہیں۔ وی آر ناٹ ڈسکسنگ اباؤٹ یور سیکنڈ میرج۔ ہم شادی کرنے یا نہ کرنے کی بات ہی نہیں کر رہے ہیں۔ آپ کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ آپ ہی بتائیے کیا ہم کیپٹن زبیر کو جانتے ہیں؟ لیکن میں اسے ابھی سے ایک

اچھی کمپنی تصور کر رہی ہوں۔آپ میری بات کا یقین کریں یہاں پہنچنے سے پہلے مجھے قطعی پتا نہیں تھا کہ انکل نے زبیر صاحب کو بتا دیا ہے‘‘۔

’’لیکن محب کو پتا تھا‘‘۔

’’یقین کریں باجی مجھے بھی پتا نہیں تھا‘‘۔

’’میں اب تمہاری بات کا یقین کر ہی نہیں سکتی۔تم یقیناً پاپا کے ساتھ ملے ہوئے ہو‘‘۔

یہ کہتے ہوئے وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔دراصل نفیسہ کا سارا غصہ جھاگ کی طرح کا تھا۔ مسلسل انکار نے نفیسہ کے اندر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔وہ غصے اور انکار کے باوجود آہستہ آہستہ ان دیکھے طریقے سے کیپٹن زبیر کی طرف بڑھ رہی تھی۔اس کے اندر اب یہ خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ کم از کم ایک بار ہی سہی مگر اس شخص کو دیکھے جو اس کو دو بچوں کے باوجود قبول کرنا چاہتا ہے۔جو اس کے بارے میں کچھ جانتا نہیں۔جس نے اس کو ایک بار بھی دیکھا نہیں۔مگر وہ اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔یہ بات یقیناً حیران کن تھی۔

چاروں طرف کے خوبصورت مناظر بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔پہاڑوں پر اُگے ہوئے درخت قطاریں بدل رہے تھے۔قدرت نے انسانی آنکھ میں حیرت انگیز کیمرے نصب کیے ہیں جو دیکھنے والوں کو تحیّر میں مبتلا رکھتے ہیں۔مگر ہم اس نعمت کے پوشیدہ اسرار سے واقف ہونے کے باوجود اس کی حیرانی میں بے دھیانی سے سفر کرتے رہتے ہیں۔ہمیں آنکھ کیا کیا دکھاتی ہے اور کیسے کیسے دکھاتی ہے، یہ صبح و شام ہمارے سامنے جاری رہتا ہے۔لیکن یہ کمالات ہمارے شعور کے دروازے پر دستک نہیں دیتے۔انسان نے اب تک اپنی تمام تر سائنسی صلاحیتوں کے وصف کیمرے پر جو کچھ تخلیق کیا ہے وہ ہماری آنکھ کے جملہ کمالات سے بہت ہی کم ہے۔یہ خالق کائنات کی حکمت ہے کہ اس نے انسانوں کو دو آنکھیں دی ہیں۔جن کی مدد سے ہم سامنے نظر آنے والی ہر شے کو اس کے اصل فاصلے پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔اگر کوئی شے قریب ہے تو وہ

قریب اور دور ہے تو دور دکھائی دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب آپ سفر کرتے ہیں تو آپ کے قریب تر اشیاء آپ کی ہی اسپیڈ سے سفر کرتی ہیں۔ مگر جیسے جیسے یہ فاصلہ بڑھتا ہے مسلسل دور ہونے والی چیز کا سفر کم رفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا قطار در قطار درختوں میں قریب تر درخت بہت جلد ہی سے قریب آتا ہے اور اتنی ہی تیزی سے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ مگر آخری حد کا درخت دیر تک ہماری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ لہٰذا قریب کی قطاریں مسلسل بدلتی جاتی ہیں اور آخری حد کو چھونے والے پہاڑ درخت یا بادل دیر تک مسافروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور دور پہاڑوں پر بنے ہوئے مکانوں کا منظر بھی تا دیر ساتھ چلتا ہے۔

سیاح زمین کے اس بھنور میں گم ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ شہروں میں ایسا منظر کہاں ملتا ہے۔ وہاں تو سڑک کے دونوں جانب چند فٹ کے فاصلے پر بنی ہوئی بلند و بالا عمارتیں دوڑ کر سفر کرنے کے باوجود نہ صرف بدلتے ہوئے مناظر کے سحر سے عاری ہوتی ہیں بلکہ جتنی جلدی وہ قریب آتی ہیں اتنی جلدی دور بھی ہوجاتی ہیں۔ یوں دوڑتی بھاگتی زندگی کا کوئی لمحہ آنکھوں میں تا دیر ٹھہر ہی نہیں پاتا۔

یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں کے وسیع و عریض میدانوں میں آنے والے سیاح جو کچھ دیکھتے ہیں وہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے بس جاتا ہے۔ ہر منظر...... ہر درخت...... ہر پہاڑ...... اور قدرت کی ہر رعنائی۔

حسین مناظر میں کھوئی ہوئی کسی بھی آنکھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ کب چلے اور کب فوجی رہائشی علاقے میں بنے ہوئے ایک پختہ مکان کے آہنی گیٹ پر پہنچے جب گاڑی رکی تو دوڑتے بھاگتے منظر بھی رک گئے اور آنکھوں کے کیمرے کے لینس پر منظر آ کر ٹھہر گیا تو احساس ہوا کہ وہ کیپٹن زبیر کے گھر پہنچ گئے ہیں۔ محب نے نظریں گھمائیں اور جب اس کی آنکھیں آہنی گیٹ پر آ کر رکیں تو وہ چونکا۔

دروازے پر کراچی سے اسلام آباد آتے ہوئے جو معصوم نو بیاہتا جوڑا ملا تھا کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ محبؔ اور نوشین دونوں اس حسین اتفاق پر حیران تھے۔

''ہیلو ڈاکٹر محب''

''یس''

''کیسے ہیں آپ؟ میں زبیر بھائی جان کی طرف سے آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں''۔

''آپ؟''

''اندر آیئے نا بیٹھ کر باتیں ہوں گی''۔

ڈرائینگ روم تک آتے آتے خواتین نے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرلیا تھا۔ محب اور عزیر بھی متعارف ہو چکے تھے۔ عزیر کیپٹن زبیر کا چھوٹا بھائی تھا۔ کراچی میں ایک پرائیویٹ چینل میں پروڈکشن سے وابستہ تھا اور والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کی اور اریبہ کی شادی ہوئی تھی۔ اور ہنی مون منانے بڑے بھائی کے ہاں مظفر آباد آیا ہوا تھا۔ پچھلے دنوں ایل۔ او۔ سی پر دراندازی کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے چند بے گناہ کشمیریوں کی وجہ سے آج آرمی ہیڈ کوارٹر مظفر آباد میں فوجی افسران کی اہم میٹنگ تھی۔ جس میں شرکت کی وجہ سے کیپٹن زبیر چند سو میٹر کے فاصلے پر ہونے کے باوجود مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود نہ تھا۔ مگر اس نے اریبہ اور عزیر کو خاص ہدایت کردی تھی کہ آنے والوں کا خاص خیال رکھیں۔ آنے والے اب سے پہلے اجنبی تھے مگر اب نہیں رہے تھے۔ یوں بھی اجنبیت ختم کرنے کے لیے گفتگو کی ڈور کا ایک سرا ہی کافی ہوتا ہے۔ اور نوشین کے پاس وہ سرا موجود تھا۔ سب ہی ایئر پورٹ کی اجنبی ملاقاتوں پر قہقہے لگا رہے تھے۔

''ایک موقع پر محب نے میری چڑ بنالی تھی''۔

''ظاہر ہے ہماری شادی کو ایک سال ہو گیا تو کیا ہوا، ہم بھی تو آخر ہنی مون منانے جا رہے

تھے۔اور یہ صاحبہ تو آپ دونوں کا ذکر کیے جارہی تھیں۔ٹوبی ویری فرینک''۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمیں نوٹس کیا۔ ویسے نوٹس تو بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔ اریبہ اور میں دونوں ہی کچھ چھوئی موئی سے واقع ہوئے ہیں۔اریبہ بہت اچھی ڈیزائنر ہیں۔ بہت ہی نفیس اور نازک چیزیں، کپڑے اور pots ڈیزائن کرتی ہیں اور میں بھی میڈیا پروڈکشن سے وابستہ ہوں۔ جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہوں اس میں جمالیات اور ذوق کا بہت خیال رکھتا ہوں۔اب مسئلہ یہ کہ ہم دونوں کی فیلڈ بھی ایسی ہے کہ ہمارے اردگرد جو پورا ماحول ہوتا ہے وہ کم وبیش شاعرانہ حسن ونزاکت کا حامل ہوتا ہے۔ بھلا ایسے ماحول میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ذہنی نفاست اور نزاکت سے گزر رہے ہوں اور جسمانی طور پر اس سے متاثر نہ ہوں''۔

''یار آپ کے ساتھ تو بڑی دلچسپ گفتگو ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ہم دونوں میاں بیوی کو بھی یہ چیزیں انسپائر کرتی ہیں۔ چونکہ یہ ہماری فیلڈ نہیں ہے تو ہم صرف رسائل، ٹی وی، اخبار کے ذریعے پیاس بجھاتے رہتے ہیں''۔

''مجھے بھی آپ سے ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے مزا آئے گا۔ بھائی جان کا ایک پرابلم ہے کہ وہ فوجی آدمی ہیں۔ان کی حس مزاح ہے تو بہت زبردست مگر وہ ہر ایک کے ساتھ نہیں کھلتے۔ چونکہ ان کا حکم تھا کہ تم دونوں سب سے پہلے یہاں آؤ تو ہم یہاں چلے آئے۔مگر آتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میں اور اریبہ اکیلے اکیلے ہی مظفرآباد یا وادی نیلم کی سیر کریں گے۔ مگر جب پرسوں مجھے پتا چلا کہ اسلام آباد اور کراچی سے کچھ مہمان آرہے ہیں تو میں بہت خوش ہوا کہ چلو اب سیر کا مزا آئے گا''۔

ایک لمحہ کے توقف کے بعد عزیر دوبارہ گویا ہوا۔

''پہلے آپ یہ بتائیے کہ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا''۔

''کشمیر میں تو کشمیری چائے لطف دے گی''۔

نوشین نے جواب دیا۔

''بابا!''

اریبہ نے آواز دی۔ اندرونی دروازے سے ایک بوڑھا ملازم داخل ہوا۔ یہ شیر دل تھا۔ گورا چٹا، درمیانہ قد، دبلا پتلا، چہرے پر سفید چھوٹی داڑھی، سر پر گرم ٹوپی اپنی پوری وضع قطع میں پہاڑوں میں رہنے والا ایک بوڑھا۔ اریبہ نے کہا۔

''بابا ہمارے لیے اچھی سی کشمیری چائے بنا دو اور بچوں کے لیے آئس کریم لے آؤ۔ بلکہ ایسا کرو کہ چائے وغیرہ بادام کے درختوں کی طرف لے آؤ ہم وہیں جا کر بیٹھیں گے''۔

یہ کہہ کر اٹھتے ہوئے اریبہ نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آیئے ہم باہر چل کر بیٹھتے ہیں''۔

اس دوران میں نفیسہ خاموشی سے چاروں طرف ماحول کا مسلسل جائزہ لے رہی تھی اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کیا تھا۔ مگر وہ تمام چیزوں اور معاملات کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ انکار کرے تو اس کے پاس دلیل ہونی چاہیے اور اقرار کرے تو بھی اس کے پاس ذاتی اور مستحکم رائے ہونی چاہیے۔

پتھروں سے بنی ہوئی اس صاف ستھری اور کشادہ عمارت کے ساتھ زمین کا ٹکڑا خوبصورت پھولوں کی کیاریوں، بادام کے درختوں اور بوگن ویلا کی بیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ زمین پر ہر طرف گھاس ہی گھاس تھی۔ ہر چیز بڑے سلیقے اور ترتیب سے اپنی جگہ لگی ہوئی تھی۔

دور افق پر چیڑ اور دیودار کے درختوں سے لدے ہوئے پہاڑ اور ان پر سایہ فگن بادلوں کے ٹکڑے نیلگوں آسمان کے نیچے تیرتے ہوئے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ وادی کی فضا نکھری نکھری اور شفاف تھی۔ ہر طرف پرسکون خاموشی تھی۔ کبھی کبھی کسی پالتو جانور کی آواز یا دور پرے نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر سے گزرتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز سے ہلکا سا ارتعاش پیدا

ہوتا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ ایک پر سکون ٹھہراؤ کا احساس دامن گیر ہو جاتا۔ سطح سمندر سے تقریباً ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر خوابناک فضا میں زندگی جیسے ٹھہر گئی ہو۔ دھوپ چبھتی نہیں اور نہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ دن کچھوے کی چال چلتا ہوا شام سے دھیرے دھیرے جا ملتا ہے اور ہم آغوش ہو کر سو جاتا ہے۔ نیلگوں آسمان رفتہ رفتہ اندھیرے کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ دن دھیمی دھیمی چال سے چلتا ہوا کب رات سے گلے جا ملتا ہے پتا ہی نہیں چلتا اور سر شام ہی اندھیرا پوری وادی کو اپنے خواب انگیز بازوؤں میں سمیٹ لیتا ہے۔ دن بھر چہچہاتے چرند پرند درختوں، منڈیروں، مچانوں، چھجوں کی دور گھپاؤں میں جا چھپتے ہیں۔ اندھیرے کی چادر کے ساتھ جل اٹھنے والے قمقمے پوری وادی میں عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ مطلع اگر صاف ہو تو آسمان پر ستاروں کی کہکشاں اور پہاڑوں پر جگمگاتے ٹمٹماتے بلب مل کر سحر انگیز فضا تخلیق کرتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ یوں لگنے لگتا ہے جیسے کسی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ حسین وادی کے ہر مکان کے ہر کمرے کے ہر بستر، ہر تکیے پر دھری دو آنکھوں میں اترتی ہوئی نیند کی وادی میں خواب بھی کم و بیش جنت نظیر وادیوں کے ہی ہوتے ہیں۔ جہاں ہر شے سنہرے رنگوں میں ڈھلی ہوئی، ہر موسم گلابوں سے سجا ہوا، ہر فضا چاندی کی طرح چمکتی ہوئی اور ہر احساس خوشبو میں بسا ہوا ہوتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہاں جس طرح دن جلدی چھپ جاتا ہے اسی طرح نکل بھی جلد ہی آتا ہے۔ یہاں نیند جتنی قوت سے بازو پھیلا کر ہم آغوش ہوتی ہے۔ اتنی ہی آہستگی سے وہ اپنے بازوؤں کو کھول بھی دیتی ہے۔ چرند پرند اپنی اپنی گھپاؤں سے نکل آتے ہیں۔ پھول اپنی پنکھڑیاں کھول کر دن کو سلام کرتے ہیں۔ کسمساتے بدن انگڑائیاں لیتے بیدار ہو جاتے ہیں۔ سورج دور پہاڑوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے اپنی چاندی جیسی کرنیں پوری وادی میں بانٹ دیتا ہے۔ پہاڑوں پر بنی ہوئی گزرگاہوں سے لوگ اترتے چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں زندگی کی ایک نئی صبح کا اعلان کرتا ہے کہ یہ زندگی ہے اسے یوں ہی رواں دواں رہنا

ہے۔

بادام کے درختوں کے سائے میں پڑی ہوئی بید کی کرسیوں پر چاروں طرف کی ساحرانہ فضا میں بیٹھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ بابا چائے اور نمکین لوازمات درمیانی تپائی پر سجا کر جا چکا تھا۔ اریبہ نے سب کو چائے پیش کی۔ حرا اور طلال پہلے ہی آئس کریم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور گھاس کے قطعہ پر دوڑتے پھر رہے تھے۔

چائے کی چسکی لیتے ہوئے محبّ نے عزیر سے پوچھا۔

''آپ نے الیکٹرانک میڈیا کی فیلڈ کیوں جوائن کی؟ کیپٹن صاحب اور آپ کی فیلڈ میں کوئی ربط نہیں ہے۔ بالکل علیحدہ علیحدہ سمتوں سے تعلق رکھتے ہیں''۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے والد صاحب ایک بزنس مین ہیں۔ وہ بالکل علیحدہ ہی سمت کے مسافر ہیں۔ بابا نے بہت چاہا کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے کوئی تو ایسا ہو کہ ان کے بزنس کو سنبھالے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ بھائی جان کا مزاج بزنس کی طرف تھا اور نہ میرا''۔

''اور یہ الیکٹرانک میڈیا؟''

''محبّ صاحب!''

''ایکسیوزمی! اب ہم میں اتنی بے تکلفی تو ہوگئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو نام سے پکار سکیں''۔

''دراصل عزیر کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر ایک سے صاحب کر کے مخاطب ہوتے ہیں''۔

اریبہ نے لقمہ دیا۔

''یہ اچھی عادت ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو عزت دے رہے ہیں۔ اور پھر یقینی طور پر آپ خود بھی عزت کروائے جانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں''۔

نفیسہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ جس پر عزیر نے فوراً کہا۔

’’میں بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے کہوں کہ آپ بھی کچھ بولیں۔ ویسے بھی جمہوریت ہے ہر ایک کو بولنے کا حق ہے۔تو پھر بھلا آپ کو کیوں نہیں‘‘۔

’’میں آپ سے میڈیا کے کردار پر بہت اچھی......‘‘

’’ایک منٹ‘‘

عزیر نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

’’پہلے یہ طے کرلیا جائے کہ ہم ایک دوسرے کو کس طرح مخاطب کریں گے۔ یہ جناب مجھے عزیر صاحب، عزیر صاحب اور آپ جناب مجھے آپ جیسے القابات سے مخاطب کر رہی ہیں۔ یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں آپ کہوں اور آپ مجھے تم سے پکاریں۔ آخر میں چھوٹا ہوں۔ یہ میرا بنیادی حق ہے‘‘۔

’’دراصل ہمیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔لیکن تمہارا یہ کہنا بہت اچھا ہے۔اس سے قربت کا احساس ہوتا ہے‘‘۔

نوشین نے کہا۔ پھر اریبہ نے رائے دی۔

’’بالکل ٹھیک کہا آپ نے دراصل محبت بھرے لفظوں میں اور بدتمیزی کے جملوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔دونوں اپنے پورے جملے کی ساخت اور بولنے والے کے لہجے سے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ ویسے ہماری دلچسپیاں مشترک ہیں اس کی وجہ سے ایک قدرتی انڈراسٹینڈنگ موجود ہے۔جیسے ابھی بات ادھوری رہ گئی تھی الیکٹرانک میڈیا والی‘‘۔

یہ کہتے ہوئے اریبہ نے نفیسہ کی طرف دیکھا تو نفیسہ نے کہا۔

’’میں سوچتی تھی کہ اس پر لکھوں۔مگر آج عزیر کی موجودگی میں مجھے زیادہ آسان لگ رہا ہے کہ اس پر گفتگو کی جائے۔ دراصل جس طرح ہم سارے دن کا کھانا ایک وقت میں نہیں کھا سکتے۔ ایک پرائمری کے طالب علم کو سیکنڈری کی کتابیں نہیں پڑھا سکتے۔ یا ایک کمزور آدمی کو میرا تھن نہیں

دوڑا سکتے۔ اس طرح ناظرین پر میڈیا کی اتنی آزادی یکدم سامنے نہیں لاسکتے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے ایک معمولی بخار کے مریض کو ہم لائف سیونگ ڈرگس دے دیں''۔

''مطلب آپ میڈیا کو کیسا دیکھنا چاہتی ہیں؟''

''میں تو چینلز کو گھما گھما کر تھک جاتی ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے سوسو چینلز دیکھ کر کہیں کچھ ڈھنگ کا پروگرام نہیں ملتا اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بیک وقت کئی چینلز پر ایسے پروگرام آ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ ادھر وقفہ ہوتا ہے دوسری طرف بھاگتے ہیں ادھر وقفہ ہوتا ہے اور کسی طرف۔ اور بعض چینل تو آزادی کا غلط استعمال بھی کر رہے ہیں''۔

''میں آپ کی بات کا کیا مطلب نکالوں۔ کیا چینل کم ہونے چاہئیں یا کچھ اور''۔

''کم ہونے کی تو بات ہی نہیں ہے ابھی تو یہ اور بڑھیں گے''۔

نوشین نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہ تو میرا مطلب چینل کے کم کرنے سے ہے اور نہ ہی کوئی اور مطلب ہے۔ بات اصل معیار کی ہے''۔

نفیسہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اب ہو یہ رہا ہے کہ ہر شخص بغیر کسی ٹریننگ اور صلاحیت کے ڈرامہ بناتا ہے جس میں نہ کہانی ہوتی ہے اور نہ کردار نگاری نہ ہی واقعات کا سلسلہ اور تسلسل ہوتا ہے۔ ایک منظر میں اگر سات افراد کمرے میں موجود ہیں۔ آٹھواں دروازے سے داخل ہوتا ہے سب چونک اٹھتے ہیں۔ اب کیمرہ ہر ایک کو فوکس کرے گا۔ بیک گراؤنڈ سے ڈھن ڈھن ڈھن۔ ڈھن ڈھن ڈھن ڈھن کی آوازیں سنائی دیں گی۔ پتا چلا جس بات کو کہنے کے لیے چند ثانیے درکار تھے اسے پروڈیوسر نے سات منٹ میں پیش کیا۔ لہذا جو ڈرامہ پندرہ سے بیس یا تیس قسطوں میں پیش ہوسکتا تھا وہ اتنا لمبا ہوتا چلا جاتا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا''۔

''میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ یہ چیز دراصل تخلیقی جوہر کی کمی کی نشاندہی کرتی ہے''۔

عزیر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''چینلز کے ذریعے جہاں ہم بہت ساری اچھی چیزیں امپورٹ کر رہے ہیں وہیں خرافات اور بے کار چیزیں بھی چلی آ رہی ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا تو لوگوں کا کام ہے کہ وہ کس چیز کو پیش کریں اور کس کو نہیں''۔

محب نے کہا تو نفیسہ نے ٹوکتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ انسپائریشن اور چربہ سازی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جس شخص میں تخلیقی صلاحیت ہوگی وہ نہ صرف اس فرق سے واقف بھی ہوتا ہے بلکہ چربہ سازی سے گریز بھی کرتا ہے۔ ہاں اگر اسے کوئی سبجیکٹ یا آئیڈیا متاثر کرتا ہے تو وہ اسے من وعن پیش نہیں کرتا اور نہ ہی اس آئیڈیے پر اپنی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ وہ اپنی ذہنی صلاحیت اور تخلیقی عنصر سے نیا خیال تشکیل دیتا ہے۔ اسے ڈیزائن کرتا ہے، فارمیٹ بناتا ہے، اسکرپٹ لکھتا ہے، لکھواتا ہے۔ تب کہیں جا کر کوئی اوریجنل چیز سامنے آتی ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب بھیڑ چال چل رہے ہوں''۔

''آج کل میں بھی ایک سوپ ڈرامے کے آئیڈیے پر کام کر رہا ہوں اور اس وقت سوپ ڈرامے پوری دنیا میں بن رہے ہیں اور مقبول بھی ہو رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ انسپائریشن ہے کہ چربہ سازی؟''۔

عزیر نے نفیسہ سے پوچھا تو نفیسہ نے لمحہ بھر کو سوچتے ہوئے کہا۔

''ہوں! یہ تو آپ کا ڈرامہ دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے کہ آپ کچھ نیا تخلیق کر رہے ہیں کہ وہی پرانا دُہرا رہے ہیں۔ جب یہ آن ایئر ہو تو بتانا پھر دیکھ کر بتاؤں گی اور بالکل بے لاگ رائے دوں گی۔ میں لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہیں ہوں''۔

''ابھی تو کم از کم چھ ماہ تک آن ایئر نہیں ہوگا''۔

''حیرت ہے ۔لوگ تو ایک دو ماہ کے لیے دبئی سنگاپور یا ادھر اُدھر جاتے ہیں اور ڈرامہ ریکارڈ کرلاتے ہیں''۔

''ہاں ایسا ہوتا ہے اور ایسا میں بھی کر سکتا ہوں۔لیکن جب ہم بات تخلیق کی کر رہے ہوں تو تخلیق آپ سے وقت مانگتی ہے۔میرے ڈرامے کی جو کہانی ہے۔وہ تو میں آپ سے اس وقت شیئر نہیں کرسکوں گا۔لیکن میں سرسری بتا رہا ہوں کہ اس میں ایک نفسیاتی الجھاؤ ہے۔اور کرداروں کی جو سائیکی ہے وہ بھر پور توجہ چاہتی ہے۔کہانی میں ڈیٹیلز بہت ہیں ۔کچھ کردار تو مسلسل فلیش بیک میں رہیں گے۔لہذا ایک ہی اپی سوڈ میں جو کردار ادھیڑ عمر کا ہے اس کا نوجوانی کا دور بھی ساتھ ساتھ ہے۔میری کوشش یہ ہے کہ وہ کردار جب اپنی جوانی میں ظاہر ہو تو اس زمانے کا رنگ ڈھنگ، ماحول، کلچر اور کردار کی عمر کے لحاظ سے اس کی مکمل ڈیولپمنٹ یعنی ہر شے مختلف ہو۔لہذا ہوتا یوں ہے کہ ہم کچھ چیزیں تو فوراً ڈیزائن کر لیتے ہیں۔اور اسے ریکارڈ بھی کر لیتے ہیں۔لیکن کچھ چیزیں پوسٹ پروڈکشن کا حصہ ہوتی ہیں۔ان تمام چیزوں میں انوالمنٹ بہت ضروری ہے۔ میں پوری طرح انوالو ہو کر کام کرتا ہوں''۔

''لیکن ابھی تو آپ نے اتنا زیادہ کام نہیں کیا ہوگا؟''

''لیکن جو بھی کر رہا ہوں پوری ڈٹرمنیشن کے ساتھ کر رہا ہوں جب ڈاکومینٹریز کیں تو بھرپور طریقے سے کیں۔ پھر ٹاک شو کیا وہ بھی پوری انفرادیت اور نئے پن کے ساتھ کیا۔اب ڈرامہ کر رہا ہوں تو انشاءاللہ ہٹ کر ہی کروں گا''۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ اونچی ڈھلوان چھتوں والی عمارت کے باغ میں کھلنے والے دروازے سے بابا شیر دل نمودار ہوا۔اس نے وہیں سیڑھیوں سے ہی آواز لگائی۔

''عزیر صاحب آپ کے لیے صاحب کا فون ہے''۔

''ایکسیوزمی! میں ابھی آیا''۔

یہ کہتے ہوئے عزیر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ لوٹا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔

''مہمانوں کے لیے خوشخبری ہے۔ رات کا کھانا ہم پیر چناسی میں کھائیں گے''۔

''کیا کوئی ہوٹل ہے؟''

نوشین نے پوچھا۔

''نہیں یہ ہوٹل نہیں ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت مقام ہے۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار بھی ہے۔ ایک پر کیف اور حسین جگہ ہے گو کہ میں نے بھی ابھی نہیں دیکھی۔ لیکن کل میں شیر دل بابا سے یہاں کے حسین مقامات کے بارے میں بات کر رہا تھا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا اور اگر میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تو سارا مزہ جاتا رہے گا''۔

''کیا زبیر بھائی جان کا فون تھا؟''

اریبہ نے پوچھا تو عزیر نے جواب دیا۔

''ہاں! وہ بس آدھ پون گھنٹے میں آرہے ہیں''۔

''لیکن ہماری تو ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی اور ہم گھومنے چلے جائیں؟''

''جناب وہ بھی ساتھ چلیں گے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگوں کو تیار ہونے میں وقت لگے گا۔ آپ ذرا دیکھئے وہ وہاں سے بیٹھے گھومنے پھرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں جب کہ ابھی ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ اگر ملاقات ہوگئی تو کیا پلاننگ کریں گے''۔

عزیر نے بے ساختگی سے کہہ دیا مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اچانک کیا کہہ بیٹھا ہے۔ کیونکہ نفیسہ کے چہرے پر حیرت، غصے اور شرم کا باہمی امتزاج ایک لمحے کو نمودار ہوا تھا مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ نوشین اور محبت کے چہروں پر ہلکی سے مسکراہٹ ابھری تھی تاہم دونوں فوراً دوسرے ہی لمحے سپاٹ چہرے کے ساتھ فوٹو بنوانے کے جیسا پوز دینے لگے۔ اریبہ نے عزیر کو غصے سے دیکھا۔ عزیر نے اسے دیکھتے ہوئے ایسا منہ بنایا جیسے کہہ رہا ہو۔

''اب کیا کر سکتا ہوں''۔

نفیسہ دونوں بچوں کو لے کر کمرے میں چلی آئی۔ اسے تیار کیا ہونا تھا صرف کپڑے تبدیل کرنے تھے۔ اس نے پہلے دونوں بچوں کو تیار کروایا اور انہیں ہلکے گرم کپڑے پہنائے۔ اور پھر خود تیار ہونے چلی گئی۔ اسے رہ رہ کر کیپٹن زبیر کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر غیر ارادی طور پر دھیان اسی طرف چلا جاتا۔ اس کشمکش میں اس نے خود سے سوال کیا کہ یہاں کیوں آ گئی؟ مگر اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اس خیال کی حامی تو نہیں تھی کہ صرف لڑکے ہی لڑکیوں کے ہاں جائیں اور رشتہ طے کریں مگر نفیسہ نے یہاں آنے سے پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا ہوا تھا کہ وہ اگر جائے گی تو یہ کوئی رشتہ قائم کرنے کے لیے نہیں ہوگا۔ وہ اپنے امی پاپا کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام تر بحث کے باوجود نوشین اور محبت کے کہنے پر یہاں چلی آئی تھی۔

اب وہ تمام خیالات کو جھٹکتے ہوئے یہ سوچنے لگی کہ اس کا کیپٹن زبیر سے کس طرح سامنا ہو۔

دوسری طرف کیپٹن زبیر کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مظفر آباد ہیڈ کوارٹر میں جاری میٹنگ کے دوران ہونے والی گفتگو جائزہ اور لائحہ عمل پر اس کا دھیان کم کم تھا۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ L O C پر دراندازی کی صورت میں کیا کیا اقدامات کیے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان اور کشمیر انتظامیہ کو کیسے رپورٹ کی جاتی ہے۔ اور جوابی کاروائی کے لیے کیا کیا پلاننگ درکار ہوتی ہے۔ وہ تو آج کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کے دھیان کی گاڑی تو کسی اور ہی راستے پر سفر کر رہی تھی۔ جب آج سے آٹھ سال پہلے جہلم کے نواحی گاؤں میں سیلاب کے بعد ریسکیو آپریشن کے دوران راولپنڈی کے کسی کالج سے آئی ہوئی لڑکیوں کو بذریعہ کشتی ایک محفوظ مقام پر منتقل کیا جا رہا تھا۔

گاؤں کے پکے مکان کی چھت پر چڑھی ہوئی ان لڑکیوں اور اس گھر کے دیگر افراد کو لائف بوٹ میں سوار کراتے ہوئے سیکنڈ لیفٹننٹ زبیر اور دیگر فوجیوں نے ان لڑکیوں اور خصوصاً اس شوخ و چنچل لڑکی کو بہت حیرت سے دیکھا تھا جو اپنی تمام دوستوں میں سب سے زیادہ قیامت خیز سیلاب کو ایڈونچر بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

یہ نفیسہ تھی جو اپنی کالج کی دوستوں کے ساتھ پنجاب انٹر کالجیئٹ کرکٹ ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے جہلم آئی ہوئی تھی۔ ان کے کالج کی ٹیم پہلے ہی راؤنڈ میں مقابلے سے باہر ہو چکی تھی۔ نفیسہ اور اس کی دوستوں کو دراصل کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہاں سنجیدگی سے ٹورنامنٹ میں حصہ لینے آئی تھیں۔ ان کا مقصد تو ہلا گلا اور انجوائمنٹ تھا۔ لوگ شکست کے بعد اداس ہوتے ہیں۔ یہ سب خوش تھیں کہ چلو اب گھومیں پھریں گے۔ یہاں سے تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ٹیم میں شامل عذرا مختار کا گاؤں تھا۔ جہاں وہ اپنی تمام دوستوں کو لے جا کر اپنی والدہ سے ملوانا چاہتی تھی۔

کالج کی ان لڑکیوں نے ہارنے کے تیسرے دن فائنل مقابلے دیکھے بغیر عذرا کے گاؤں کی طرف کوچ کیا۔عذرا کے ابا اماں اور بھائیوں نے سب کا استقبال بڑے دل و جان سے کیا اور ایسی خاطر مدارات میں جڑ گئے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔عذرا کے گھر والوں کی محبت اور گاؤں کی خوبصورت اور پر کیف فضا نے ان سب کے پیروں میں ٹور کے بقایا دن یہیں گزارنے کی خواہش کی بیڑیاں ڈال دیں۔

سارا دن گاؤں میں دھما چوکڑی مچاتی لڑکیوں نے گاؤں بھر میں اعلان کر دیا تھا کہ شہر سے ہلڑ بازوں کا کوئی ٹولہ آیا ہوا ہے۔ساری لڑکیوں کے اجلے کپڑے مٹی کیچڑ سے بے رنگ بے نور ہو رہے تھے۔گاؤں کے کچے رستوں کی گیلی مٹی بتا رہی تھی کہ پرسوں ہی طوفانی بارش نے پورے گاؤں کی خشک مٹی کو خوب سیراب کیا ہے۔بارش کے بعد کی فضا نے ویسے بھی گاؤں کو نکھار دیا تھا۔ دُھلے دُھلے درختوں اور سایہ کیے ہوئے نیلے آسمان کے درمیان بادلوں کی دبیز تہ اب بھی موجود تھی ۔گاؤں کے بوڑھوں کا خیال تھا کہ ابھی اور طوفانی بارش ہونا باقی ہے اور پھر ہوا بھی یہی۔

آہستہ آہستہ پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی بونداباندی شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش کی صورت میں ڈھل گئی۔چاچا مختار کے گھر کا صحن بارش سے جل تھل ہو رہا تھا۔مگر آج اس صحن کے بیچ بارش میں بھیگتی ہوئی دس بارہ لڑکیاں قہقہے بکھیرتی ہوئی کبھی رسی کود رہی تھیں تو کبھی جھولوں کے تیز تیز جھونٹوں کا مزہ لے رہی تھیں۔تھوڑی دیر بعد شیطانوں کا ٹولہ مکان کی چھت پر چڑھ گیا۔بارش اب کچھ اور زیادہ شدت کے ساتھ برس رہی تھی۔دالان میں کھڑی ہوئی عذرا کی ماں نے زور سے آواز لگائی۔

''اللہ خیر کرے کڑیو۔بوں خطرناک مینہ وے تھلے آ ونجو۔ماڑ رلگنا پیا اے''۔

مگر ان کی آواز بارش کے شور میں دب کر رہ گئی۔جسم پر تڑ تڑ پڑنے والی بوندیں آخر تھکا ہی دیتی ہیں۔دیر تک بھیگنے کے بعد لڑکیاں تھک کر نیچے آ گئیں تھیں۔گھر کے مردوں اور عذرا کی ماں

کے چہرے پر اب تفکر اور پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ لڑکیوں کو بھی اب بارش میں کوئی مزہ نہیں آ رہا تھا۔ صحن کے دائیں طرف بنے ہوئے بڑے کمرے میں سب کے لیے فرشی بستر کا انتظام تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ چمکتی لپکتی اور مچلتی بجلی کی گڑگڑاہٹ اور نہ تھمنے نہ رکنے کا اشارہ دیتی ہوئی طوفانی بارش کو دیکھ کر لڑکیوں پر بھی انجانا سا خوف طاری ہو رہا تھا۔ لہٰذا وہ سب عذرا کے ساتھ کمرے میں جا دبکیں۔

تسبیح کے دانوں پر مچلتی انگلیوں سے اللہ اللہ کا ورد کرنے والے چاچا مختار نے اپنے بیٹوں سے کہا۔

''اج تے اللہ خیر کرے۔ ماخوف آنا پیا اے''۔

''پچھلی وار سو کا یا۔ لگنا اے اس واری کسر نکل اے سی''۔

دین محمد بولا۔ ابھی وہ بات کر ہی رہے تھے کہ بارش کے شور میں کچھ اور آوازوں کا شور بھی شامل ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے چیخ رہے ہیں۔ دین محمد سے چھوٹا فتح محمد تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے گاؤں کے بہت سارے لوگوں کی آوازیں اور اندھیرے میں بے سمت دوڑتے قدموں نے بتا دیا کہ بند ٹوٹ گیا ہے۔ وہ گھبراہٹ میں پلٹا اور چیخ کر بولا۔

''بابا! بند ٹوٹ گیا''

''یا اللہ خیر!''

اچانک ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل مچ گئی۔ شور کی آواز سے لڑکیاں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ گاؤں کی گلیوں میں بارش کی جل تھل تو پہلے سے موجود تھی۔ مگر دریا کا پانی گاؤں میں تیزی سے داخل ہو رہا تھا۔ سیلابی ریلا بڑھتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی گلیوں سے گھروں میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ لوگ محفوظ پناہ گاہوں کی تلاش میں دوڑ رہے تھے۔

کچھ لوگ اپنا سامان بچانے کی فکر میں لگ گئے، کچھ بچوں کو تو کچھ بوڑھے والدین کو۔ ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ جن گھروں کی چھتیں پختہ تھیں لوگ ان پر چڑھ گئے۔ چاچا مختار کا گھر بھی پختہ تھا جس میں پکا زینہ بھی بنا ہوا تھا۔ چاچا مختار نے تمام بچیوں اور اپنی بیوی کو چھت پر بھیج دیا تھا۔ چھت پر ایک کونے میں ڈالے ہوئے سائبان کے نیچے ساری لڑکیاں اور عذرا کی ماں جا کر دبک گئے تھے۔

بارش اب بھی تیز رفتاری اور گھن گھرج سے برس رہی تھی۔ گاؤں کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ اس دوران میں چاچا مختار، دین محمد، اور فتح محمد نے مل کر گھر کا جو جو سامان بچایا جا سکتا تھا اسے محفوظ جگہ پر رکھ دیا تھا۔ ذرا دیر پہلے جو پانی گھٹنوں تک تھا اب کمر تک آ گیا۔ پانی مسلسل بڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے برستا ہوا پانی تھم گیا۔ اور پھر حیرت انگیز طور پر بڑھتا ہوا سیلابی پانی بھی ایک جگہ آ کر رک گیا۔

شہری لڑکیوں کا ایڈونچر کافور ہو چکا تھا۔ اندھیرے میں وہ زیادہ دور دیکھ نہیں پا رہی تھیں مگر انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دور تک پھیلے ہوئے ایک سمندر کے بیچ چھوٹے سے جزیرے پر ہوں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس سے بھی لطف اندوز ہوتیں لیکن اس وقت انہیں صرف یہ احساس دامن گیر تھا کہ وہ یہاں سے نکلیں گی کیسے۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اندھیرے میں چھتوں پر چڑھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو اپنے خیریت سے ہونے کی اطلاع دے رہے تھے۔ چھتوں پر ہونے والی اس پیغام رسانی سے پتا چل رہا تھا کہ گاؤں میں کس کس کو پریشانی کا سامنا ہے اور کون کون محفوظ ہے۔ چاچا مختار چھت پر بچیوں کے پاس چلا آیا تھا اور دین محمد اور فتح محمد دنوں گاؤں کی گلیوں میں تیرتے ہوئے نکل گئے۔ یہی تو وقت تھا ایک دوسرے کی مدد کرنے کا۔ گاؤں کے کچھ مکان اونچے اور پختہ تھے جہاں سیلابی پانی سے کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا تھا۔ کچھ مکان ایسے تھے جو تھے تو پختہ مگر اونچائی پر نہیں تھے۔ وہاں لوگ

سامان کو محفوظ اونچائی پر رکھ کر خود چھتوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ لیکن ایک بڑی تعداد ایسے مکانوں کی تھی جن کی دیواریں کچی اینٹوں اور کچی مٹی سے لیپی ہوئی تھیں۔ جن کی چھتیں بانس پھونس چٹائیوں اور بلیوں سے بنائی گئی تھیں۔ گاؤں کے ایسے مکانوں میں سامان بھی آرائشی اور زیادہ نہیں ہوتا بس زندگی گزارنے کی چند ضروری چیزیں چار پائیاں تخت اور کچھ برتن بھانڈے۔ ایسے گھروں میں سب سے قیمتی شے ان کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔

اس وقت پانی نے سب سے زیادہ انہیں ہی نقصان پہنچایا تھا۔ گاؤں کے بہت سے جیالے دین محمد اور بہت سے نوجوان فتح محمد رات کی اس تاریکی میں دوسروں کی مدد کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔

کہتے ہیں پانی کی طاقت کا اندازہ پانی میں اتر کر ہوتا ہے۔ گاؤں کے بوڑھے مرد عورتوں اور چھوٹے معصوم بچے بچیوں کو اپنے کاندھوں پر بٹھا کر جیالے نوجوانوں نے کمر کمر تک پانی میں ڈوب کر پوری ہمت اور جواں مردی سے محفوظ مقامات تک پہنچانا شروع کر دیا۔ کچھ عورتوں کو چار پائیوں پر بٹھا کر اور ان چار پائی کو کندھوں پر اٹھا کر بھی نکالا گیا۔

رات کا آخری پہر ڈھلنے سے پہلے سب جانیں محفوظ ہو گئیں تھیں۔ پورا گاؤں بیدار تھا۔ ہر بچے بوڑھے مرد عورت کی آنکھ سے نیند ایسے کوسوں دور تھی جیسے غریب سے خوش حالی۔ اور پھر گاؤں میں تو صبح یوں بھی جلدی دھم دھم کرتی آجاتی ہے۔ آج بھی ویسے ہی نمودار ہو گئی مگر صبح کے ساتھ ساتھ فوجی جوانوں کی کمک لائف بوٹ اور اسٹریچرز کے ساتھ موجود تھی۔ ایک فوجی دستہ دریا کے بند کی تعمیر کے لیے ضروری ساز و سامان کے ساتھ دریا کے پاٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔

سورج کے پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے اور اجالا پھیلانے سے پہلے ایک لائف بوٹ چاچا مختار کے دروازے پر بھی موجود تھی۔ فوجی جوانوں کی اس ٹیم کی قیادت سیکنڈ لیفٹننٹ زبیر کے ہاتھ میں تھی۔

جیسے جیسے رات کا اندھیرا کم ہوا لڑکیوں کی گھبراہٹ اور خوف میں بھی کمی آتی چلی گئی۔ صبح ہونے تک وہ پوری طرح نارمل تھیں۔ ان کی شوخی کسی حد تک لوٹ آئی۔ کشتی میں سوار ہوتے ہوئے ذرا بھی محسوس نہیں ہوا کہ چند گھنٹے پہلے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

لڑکیوں کو دھڑ برابر پانی میں گاؤں کی گلیوں کے بیچ سے کشتی میں بیٹھ کر گزرنا ایڈونچر لگ رہا تھا۔ وہ سب دیدے پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں اور سیکنڈ لیفٹننٹ زبیر ان ہی کے درمیان بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اسے لحہ بھر میں بھا گئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ شوخی و شرارت بھری آنکھوں، شانوں پر جھولتے ہوئے گھنگریالے بالوں، آٹے کی لوئی جیسے جلد والی یہ لڑکی کون ہے۔

وہ یہ تو سمجھ رہا تھا کہ یہ لڑکیوں کا گروپ اس گاؤں سے نہیں ہے۔ کہیں اور سے آیا ہے۔ لیکن کہاں سے آیا ہے؟ یہ سوال تھا جس کا جواب وہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ لمحوں میں فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنی شریک حیات بنائے گا۔

کشتی سیلابی پانی پر تیرتی ہوئی ٹیلے پر آ گئی جہاں ان لڑکیوں، چاچا مختار، عذرا کی والدہ اور بھائیوں کو اتار دیا گیا۔

زبیر نے راستے میں سوچی ہوئی پلاننگ کے تحت فوراً ایک سپاہی سے کہا۔

''رانا! ان تمام لوگوں کے نام پتے اور فون نمبر درج کر لو''۔

''لیکن صاحب اس کی کیا ضرورت ہے؟''

سپاہی نے انجانے میں کہا۔

''بہت ضروری ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں ایک ایک آدمی کا ریکارڈ بہت ضروری ہوتا ہے''۔

زبیر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ رانا نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''لیکن صاحب ہمارے پاس کوئی رجسٹر وغیرہ نہیں ہے۔ کسی نے بتایا نہیں تھا ورنہ لے آتے''

''زیادہ باتیں مت کرو۔ کام کرو''۔

تھوڑی دیر میں چند کاغذوں کا بندوبست ہوگیا۔ سیکنڈ لیفٹنٹ زبیر کشتی کا اگلا ٹرپ لگانا بھول گیا تھا۔ وہ تو اس گھنگھریالے بالوں والی لڑکی کا پتا جاننا چاہتا تھا۔ آخر کار تھوڑی دیر میں وہ جان چکا تھا کہ لڑکی کا نام نفیسہ ہے۔ ریٹائرڈ میجر نہال احمد کی بیٹی ہے اور اسلام آباد میں رہتی ہے۔ ریٹائرڈ نہال احمد کا نام سیکنڈ لیفٹنٹ زبیر کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اکیڈمی میں اس کے استاد رہ چکے تھے۔

پہچان کے اس مرحلے پر وہ بڑی آسانی محسوس کر رہا تھا۔ نفیسہ کو اپنانا اسے بہت آسان دکھائی دیا۔

چند ہفتوں میں اس نے میجر صاحب تک رسائی کے لیے راستہ ڈھونڈ لیا۔ اکیڈمی کے ایک استاد جو ابھی ریٹائر نہیں ہوئے تھے اور میجر نہال احمد کے دوستوں میں سے تھے کو زبیر نے اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ مگر میجر صلاح الدین کے ایک ہی جملے نے اس کا تراشا ہوا آشیانہ خاک کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ میجر صاحب کی بیٹی کا تو نکاح ہو چکا ہے۔ میں خود اس نکاح میں شریک تھا اب تو شاید الیکشن کے بعد رخصتی بھی ہو جائے گی۔

گزشتہ کئی دن اور کئی راتوں سے دیکھے ہوئے بے شمار خواب تعبیر کی زمین پر اترنے سے پہلے ہی ہوا میں ریزہ ریزہ ہو کر تحلیل ہو گئے۔ وہ حیران تھا کہ یہ کیسی محبت اور چاہت تھی جو ایک لمحہ میں پیدا ہوئی اور شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی اور پھر ایک ہی لمحہ میں بکھر بھی گئی۔ نہ اظہار کا چراغ جلا اور نہ وصال کا دھواں اٹھا، نہ کسی سے کچھ سنا اور نہ کسی سے کچھ کہا۔ سب بے ثمر تھا اور بے ثمر ہی رہ گیا۔

پھر یوں ہوا کہ برس پہ برس گزرتے چلے گئے۔اس دوران نہ کوئی اچھا لگا اور نہ کسی کے لیے دل اس طرح اچھلا جیسا سیلابی پانی میں اچھلا تھا۔بس ہر طرف سکون تھا، خاموشی تھی، سکوت تھا کہ ایک دن اس خاموشی کے پردے کو ایک آواز چیرتی ہوئی گزر گئی۔یہ ٹیلی فون کی گھنٹی تھی جو ترقی کے فیتے سجائے مظفر آباد کی فضا میں کیپٹن زبیر کے دفتر میں بجی تھی۔دوسری طرف اکیڈمی کے استاد میجر صلاح الدین تھے۔

''میں تمہیں ایک خبر دینا چاہتا ہوں۔مجھے اندازہ نہیں کہ تمہارے لیے یہ خبر کیا حیثیت رکھتی ہے۔بہر حال جب مجھے پتا چلا تو مجھے تمہارا ہی خیال آیا''۔

''جی سر آپ کہیے میں سن رہا ہوں''۔

''اسلام آباد سے لاہور جاتے ہوئے میجر نہال احمد کے داماد کو کسی نے گولی مار دی۔اس کی ڈیتھ ہوگئی ہے''۔

''اوہ نو!''۔

ایک لمحہ کو کیپٹن زبیر کو سکتہ سا ہو گیا۔اسے فوراً نفیسہ کا خیال آیا۔اس نے پوچھا۔

''سر ان کی بیگم؟''

''وہ اور دونوں بچے ساتھ نہیں تھے۔سیکریٹری تھا وہ بھی مر چکا ہے۔میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔ہم اس پر پھر بات کریں گے''۔

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔نفیسہ کے حوالے سے کیپٹن زبیر کو ایک بار پھر دھچکہ سا لگا۔ نفیسہ کی شادی کے بعد کبھی بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ کھوج لگانے کی کوشش کی۔اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس کے دو بچے بھی ہیں۔

وہ اپنے اور نفیسہ کے اس اجنبی سے تعلق پر حیران تھا۔اس نے نفیسہ کو صرف ایک بار مگر جی بھر کے دیکھا تھا۔دونوں کے درمیان کوئی مکالمہ بھی نہیں ہوا تھا۔وہ ایک دوسرے کو صحیح طرح سے

جانتے بھی نہیں تھے اور جب وہ نفیسہ کے بارے میں جان گیا تب بھی نفیسہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

آج برسوں بعد اس کی زندگی میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں جسے ایک بار چاہا اور پھر ساری عمر اس کی خاموش چاہت میں گزار دی، آج اپنے شریک سفر سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ خود کو اندر سے خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ دکھ نفیسہ کا نہیں اس کا اپنا ہے۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگا تو وہ گھر چلا آیا۔ گھر پر بے معنی ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کبھی ٹیلے کی طرف کبھی کیاریوں کی طرف اور کبھی دالان میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر بے دھیانی اور بے خیالی کی چادر اوڑھے، خلا میں بے یقینی سے آنکھیں الجھاتے ہوئے جب بابا شیر دل نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''صاحب آپ کچھ الجھے الجھے لگتے ہو۔ کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے''۔

''ہوں! نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے''۔

''صاحب میں نے آپ کے لیے آج سوپ بنایا ہے۔ ابھی میں گرم گرم سوپ لاتا ہوں آپ پئیں اور آرام کریں''۔

''رہنے دو دل نہیں چاہ رہا''۔

کیپٹن زبیر نے بے دلی سے کہا۔ جہاندیدہ بابا شیر دل نے جواب دیا۔

''آپ اندر چل کے لیٹ جائیں۔ یہاں ٹھنڈ لگ جائے گی۔ ویسے بھی مجھے سوپ بنانا اتنا اچھا نہیں آتا۔ میری چھوٹی بہو بہت اچھا سوپ بناتی ہے۔ یہاں بھی کوئی بیگم صاحبہ ہوتیں تو وہ بناتیں مہین مہین چکن اور کارن فلور کا گاڑھا گاڑھا سوپ۔ میں نے ایسا ہی الٹا پلٹا بنا چھوڑا ہے''۔

کیپٹن زبیر نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور بولا۔

''اچھا ایک پیالہ لے آئیں میں پی کر بتاؤں گا کہ آپ نے کیسا سوپ بنایا ہے''۔

''ٹھیک ہے، آپ کمرے میں چلیں، میں وہیں لے کر آتا ہوں''۔

''اس میں تو مہین مہین چکن اور گاڑھا گاڑھا کارن فلور کا سوپ بھی موجود ہے۔ آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو اچھا سوپ بنانا نہیں آتا''۔

بابا شیر دل نے محبت سے کہا۔

''اگر میں ایسے نہیں بولتا تو آپ پینے کا کہتے بھی نہیں''۔

کیپٹن زبیر نے بستر پر بیٹھے بیٹھے سوپ لیتے ہوئے کہا۔

''اور وہ آپ نے بیگم صاحبہ والی بات کیا کہی؟''

بابا شیر دل نے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے سینے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بابا ان پہاڑوں پر اترتے چڑھتے ایسے ہی بوڑھا نہیں ہو گیا۔ دفتر میں کھٹ پھٹ ہو تو بندے کا چہرہ الگ لگتا ہے، ماں باپ سے ہو تو الگ، اور اگر کوئی اور بات ہو تو بالکل ہی الگ لگتا ہے''۔

''میرے چہرے پر آپ کو کیا لگ رہا ہے؟''

''آج آپ کو کوئی بہت دکھ بھری خبر ملی ہے۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو یا جسے آپ بہت زیادہ چاہتے ہیں اس کی کوئی شے گم ہو گئی ہے''۔

کیپٹن زبیر نے چونکتے ہوئے بابا کو دیکھا۔ اور حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''ٹھنڈ پڑے، مینہہ برسے، برف گرے، جانور بچہ دے یا کیاری میں نیا پھول کھلے۔ بس پتا لگ ہی جاتا ہے۔''

بابا شیر دل نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں مزید کہا۔

''لیکن آپ نے حیران ہو کر اور پکا کر دیا کہ میں نے سچ بولا ہے''۔

''نہیں بابا ایسا کچھ نہیں ہے بس ایک شخص کے مرنے کی خبر ملی تھی۔اس نے دکھی کر دیا''۔

''اللہ خیر کرے، کون تھے؟''

''لاہور میں رہتے تھے''۔

''بیوی بچے بھی ہوں گے؟''

''ہاں......! دو بچے تھے''۔

''آپ ان کی بیگم کو جانتے ہوں گے؟''

''ہوں''۔

بابا نے محسوس کیا کہ کیپٹن زبیر کی ہوں کہیں بہت دور سے آئی ہے۔ بابا نے سوپ کا پیالہ لیا، زبیر کے پیروں پر کمبل ڈالا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے دھیان کی گاڑی رفتہ رفتہ اپنی ڈگر پر آ گئی۔ کمرے میں دیگر فوجی افسران علاقے کے جغرافیائی نقشے پر نظریں گاڑے لائن آف کنٹرول پر ہونے والی شرانگیزی پر گفتگو میں مصروف تھے۔ کیپٹن زبیر نے کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ پانچ بج رہے تھے اب وہ جلدی گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

(۶)

نفیسہ نے طلال اور حرا کے کپڑے تبدیل کروا کر دونوں کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور خود بھی تیار ہونے لگی۔ اس نے اپنے لیے جان بوجھ کر سفید شلوار سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اور چہرے کو بھی میک اپ سے مکمل آزاد رکھا تھا۔ حتیٰ کہ ہلکی سی لپ اسٹک کی لکیر بھی اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ سیاہ لمبے بالوں کو ایک معمولی کالے ربن میں جکڑ کر یوں ہی کھلا چھوڑ دیا۔ پیروں میں سادہ چپل ڈال کر اس نے قدِ آدم آئینے میں سراپا کا جائزہ لیا۔ سرتاپا سوگواریت میں لپٹی ہوئی خود کی جھلک دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئی۔

نفیسہ نے ایسا جان بوجھ کر کیا تھا۔ یہ اس کے ارادے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس نے اپنی چیزوں کو سمیٹا، دوپٹہ گلے میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر دروازہ کھولتے ہی یکا یک اس پر سراسیمگی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کیپٹن زبیر بیرونی دروازے کو پار کرتا ہوا سیدھا چلا آ رہا تھا۔

گھبراہٹ اور پریشانی میں اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر جم کر رہ گیا۔تب دوپٹہ کندھے سے پھسل کر اس کے پیروں میں آ گیا۔ وہ گھبرا کر اسے اٹھانے کے لیے جھکی تو ہاتھ میں پہنا ہوا کڑا ہینڈل میں پھنس گیا۔اب وہ دروازے اور فرش کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔اس نے بے بسی سے سامنے دیکھا۔اس اثناء میں کیپٹن زبیر ایک فوجی کی سی پھرتی سے اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے اس بے چارگی سے نجات دلانے لگا۔

یہ نفیسہ کی کیپٹن زبیر سے بظاہر پہلی مگر حقیقتاً دوسری ملاقات تھی۔ جو کہ عجیب وغریب صورت حال میں ہو رہی تھی۔اس دوران ہلکی پھلکی کھٹ پٹ سے آس پاس کے دروازے بھی کھل گئے اور سب لوگ کوریڈور میں آ گئے۔سب نے دیکھا کہ کیپٹن زبیر نہایت سنجیدگی سے نفیسہ کو مصیبت سے نجات دلانے میں مدد کر رہے ہیں۔

رسمی تعارف کہیں خلا میں تحلیل ہو گیا۔سب کے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔محبّ نے جملہ کسا۔

''آج ثابت ہو گیا کہ فوجی ہمیشہ مدد کے لیے سب سے پہلے پہنچتے ہیں''۔

نفیسہ نے محبّ کو گھور کر دیکھا مگر خاموش رہی۔عزیر نے آگے بڑھ کر کہا۔

''بھائی جان! یہ ڈاکٹر محبّ ہیں۔آپ مسز ڈاکٹر نوشین محبّ......''۔

کیپٹن زبیر نے جملہ درمیان میں اُچک لیا اور محبّ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔''بھئی سب سے پہلے میں دو چھوٹے بچوں سے تعارف چاہوں گا۔وہ کہاں ہیں؟''

حرا اور طلال بابا شیر دل کی انگلی تھامے ہوئے نمودار ہوئے۔کیپٹن زبیر نے مسکرا کر فوجی انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہیلو ینگ بوائے اینڈ ینگ گرل۔ویل کم ٹو کشمیر۔آئی ایم کیپٹن زبیر، ہاؤ آر یو؟''

طلال اور حرا نے اپنے ننھے منھے ہاتھ مضبوط ہاتھوں میں دے دیئے۔چمکتے فیتوں، جگمگاتے

ستاروں اور کلف لگی شاندار وردی میں ملبوس شخص ان دونوں بچوں کو اچھا لگا تھا۔ اس دوران نفیسہ رسمی تعارف اور اچانک آ پڑنے والی افتاد کی خجالت سے بچ گئی تھی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔

کیپٹن زبیر نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے صرف دس منٹ دیجئے۔ میں چینج کر کے آتا ہوں۔ گاڑی تیار ہے پھر ہم چناسی کے لیے روانہ ہوں گے''۔

پھر انہوں نے بابا شیر دل کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بابا ضروری چیزیں گاڑی میں رکھ دیں''۔

تھوڑی دیر میں جیپ پہاڑی راستوں پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

دونوں بچے اگلی نشست پر کیپٹن زبیر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلی نشستوں پر نفیسہ، محبّ، نوشین، عزیرا اور اریبہ براجمان تھے۔ اس دوران نفیسہ اور زبیر کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ البتہ زبیر نے دونوں بچوں کو ذرا سی دیر میں اپنا دوست بنا لیا۔

''ہاں تو بھئی آپ دونوں کو فوجی یونیفارم بہت اچھی لگتی ہے؟''

''جی ہاں! اور میں بڑا ہو کر نانا ابو کی طرح فوجی بنوں گا''۔

''ہماری طرح نہیں؟''

''ہاں آپ کی طرح بھی''۔

''اور میں بھی فوجی بنوں گی''۔

''آپ کیا کریں گی؟''

''جو سب کرتے ہیں۔ ڈشاں ڈشاں ڈشاں ڈشاں''۔

''ارے! کیا فوجی صرف ڈشاں ڈشاں ہی کرتے ہیں؟''

''اور بھی کچھ کرتے ہیں''۔

’’کیا کرتے ہیں؟‘‘

’’ہمیں پتا نہیں۔امی! فوجی اور کیا کرتے ہیں؟‘‘

طلال نے اچانک جملہ نفیسہ کی طرح داغ دیا۔مگر نفیسہ کے کچھ کہنے سے پہلے محبّ نے کہا۔

’’فوجی لوگوں کی مدد کرتے ہیں‘‘۔

نفیسہ نے برابر بیٹھے ہوئے محبّ کے کونی گڑھ دی۔وہ جان بوجھ کر زور سے چیخا۔

’’اُف‘‘۔

’’کیا ہوا؟‘‘

’’کچھ نہیں زبیر صاحب لگتا ہے کہ آپ کی گاڑی میں پہاڑی چیونٹیاں گھس آئی ہیں‘‘۔

سب کا ملا جلا قہقہہ گاڑی میں گونج اٹھا۔آدھے گھنٹے کی مسافت پر پیر چناسی کا علاقہ اور اس کے اردگرد پہاڑ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت شاہ حسین کا مزار ذرا فاصلے پر دکھائی دے رہا تھا۔مزار کے اردگرد کی فضا خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ماحول میں ہلکی ہلکی خنکی چھائی ہوئی تھی۔مگر ہوا بند تھی۔مزار کے اردگرد لگے ہوئے جھنڈے بھی ایسے سرنگوں تھے جیسے عبادت میں مصروف ہوں۔چاروں طرف فضا میں کہر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔اکتوبر میں پیر چناسی کا بلند مقام اپنا رنگ بدلنا شروع کر دیتا ہے۔چمکیلی دھوپ، بارش، کہر باہم ویکجا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔کبھی ایک چھپتا ہے تو دوسرا ڈھونڈ مچاتا ہے اور جب دوسرا چھپتا ہے تو پہلا یا تیسرا ادھم مچا دیتا ہے۔مظفرآباد سے اکثر لوگ یہاں شکار کھیلنے آتے ہیں۔آڑھے ترچھے راستوں، گھاٹیوں میں ہموار سطح پر خیموں میں رات بسر کرتے ہیں۔اس وقت بھی چند ایک خیمے ایستادہ تھے۔

’’کیا زبردست جگہ ہے‘‘۔

محبّ نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

''یہ پورا علاقہ ایسی خوبصورت جگہوں سے بھرا پڑا ہے''۔

کیپٹن زبیر نے جواب دیا۔

''اور یہاں سکون کس قدر ہے۔ خاموشی اور خوابیدگی کا لباس اوڑھے ہوئے ہر شے کتنی بھلی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی یہاں آ کر ٹھہر سی گئی ہو۔ بالکل شانت، جی چاہتا ہے کہ آدمی ہمیشہ کے لیے یہاں بس جائے''۔

محب نے لمحے بھر کے توقف اور پھر ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''مگر افسوس یہ ہے کہ ہم یہاں سے بےزار بھی جلدی ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہم اپنے شب و روز شور شرابہ ہنگام، ٹریفک کے شور، آلودگی اور ایک عجیب قسم کی افراتفری اور گہما گہمی کے درمیان گزارنے کے عادی ہو چکے ہیں''۔

اس دوران تمام افراد گاڑی سے اتر کر سامنے درختوں کے بیچ پڑی ہوئی کرسیوں پر براجماں ہو چکے تھے۔ عزیر نے اپنا مووی کیمرہ سنبھال رکھا تھا اور وہ آس پاس کے دلکش اور سحر انگیز مناظر اور بیٹھے ہوئے تمام افراد کی فلم بنانے میں مصروف ہو گیا۔ سب اس طرح پوز دے رہے تھے کہ جیسے کیمرے سے بےخبر ہوں تا کہ مناظر میں حقیقت نظر آئے۔ کھانے کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ محب نے عزیر سے کیمرہ لیتے ہوئے کہا۔

''اب تم بیٹھو میں تمہاری مووی بناتا ہوں''۔

عزیر نے کیمرہ دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی جو آپ پر ہنگام زندگی گزارنے کے عادی ہونے کا ذکر کر رہے تھے تو مجھے ایک فلم یاد آ گئی۔ کمل ہاسن کی پشپک۔ جس میں اس کا کریکٹر ایسے ہی آدمی کا ہے جو ایک ایسے محلے میں رہتا ہے جہاں دن رات شور شرابہ، ہنگامہ، گالم گلوچ، گانے بجانے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ اسی شور میں سویا بھی کرتا تھا۔ ایک بار اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں رات گزارنے کا موقع ملتا ہے۔

وہاں اسے نیند نہیں آتی۔ تنگ آ کر وہ اپنی بستی میں آتا ہے، ٹیپ ریکارڈر سے وہاں کا شور ریکارڈ کرتا ہے۔ پھر ہوٹل آ کر ٹیپ آن کر کے بڑے آرام سے سو جاتا ہے۔ لہذا یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم بسا اوقات ایسی زندگی گزارنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور اس حد تک عادی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اس کے بغیر رہنا ادھورا لگتا ہے۔

اس دوران کیپٹن زبیر اور نفیسہ کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ زبیر کی خواہش تھی کہ وہ بات کرے مگر نفیسہ کے چہرے پر بے اعتنائی کی جھلک دیکھ کر وہ نہیں چاہتا تھا کہ نفیسہ اس گریز کی حالت کو اور بڑھاوا دے۔ لہذا وہ خاموش تھا۔ میجر نہال سے گفتگو میں زبیر کو پتا لگ گیا تھا کہ نفیسہ شادی کرنے سے مسلسل انکار کر رہی ہے اور اس انکار کی وجہ زبیر نہیں ہے۔ بس وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ لہذا زبیر کو یہ اندازہ تھا کہ مسئلہ صرف نفیسہ کو شادی کی جانب راغب کرنا ہے اور بس۔

تھوڑی دیر میں وہ گوشت، تکے اور پشاوری کڑھائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ درمیان میں ہلکے پھلکے چٹکلے بھی چل رہے تھے۔ محب، نوشین، عزیر اور اریبہ کی مسلسل کوشش تھی کہ فضا کو خوشگوار بنائے رکھیں۔ درمیان میں زبیر بھی شائستہ اور معنی خیز لطائف سے محفل کو گرما رہا تھا۔ مگر نفیسہ نے تاحال سنجیدگی کی چادر میں خود کو لپیٹ رکھا تھا۔ البتہ اپنے دونوں بچوں کو کھانا کھلاتے ہوئے وہ بھی کوئی ادھورا جملہ ادا کر کے لمبی خاموشی پر چلی جاتی اور سب ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتے۔

عزیر اور اریبہ کو نوشین نے پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ عزیر اپنے بھائی کے انتخاب پر خوش تھا۔ وہ نفیسہ کو اپنی بھابھی کے روپ میں سوچ کر اور خوش ہو رہا تھا۔ اسے نفیسہ اچھی لگی تھی مگر وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ آخر بھائی جان نے ایک بیوہ اور دو بچوں کی ماں سے شادی کی خواہش کا اظہار کیوں کیا ہے۔ وہ بھی تمام لوگوں کی طرح اس پس منظر سے ناواقف تھا۔ کھانے کے دوران عزیر نے اریبہ سے بات کی اور پھر سرگوشی میں محب اور نوشین سے کچھ کہا۔ چاروں نے آنکھوں

سے اثبات میں اشارہ کیا۔ زبیر لڑکے کو بلا کر چائے کا آرڈر دینے لگا تو محب نے کہا۔

''بھئی مجھے تو وہ سامنے کا منظر بہت خوبصورت لگ رہا ہے۔ میں تو وہاں جانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے اس طرف آبشار بھی ہے''۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں؟''

عزیرا اور اریبہ نے پوچھا۔

''کیوں نہیں۔ دو سے بھلے چار اور چار سے بھلے چھ۔ کیوں کہ بچے بھی ہیں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ یہاں ہم صرف بور لوگوں کو چھوڑ کر جا رہے ہیں تا کہ وہ ہمیں بور نہ کریں''۔

محب نے دونوں بچوں کی انگلی پکڑتے ہوئے کہا اور اچٹتی ہوئی نظر زبیر کے چہرے پر ڈالی جہاں ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ سنجیدگی کے دبیز غلاف سے چھلک رہی تھی۔

تنہائی ہوتے ہی زبیر کچھ کہنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ نفیسہ نے غیر متوقع سوال کر ڈالا۔ وہ بولی۔

''آپ مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟''

اس اچانک حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس غیر متوقع سوال نے بہت سارے غیر ضروری سوالوں، جوابوں اور تاویلوں کو پچھاڑ دیا ہے۔ اور اب بات بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا۔

''میں اب تک سوچ رہا تھا کہ آپ سے کیا بات کی جائے اور کیا نہ کی جائے۔ مگر آپ کے سوال نے مجھے بہت آسانی مہیا کر دی ہے۔ آپ کا یہ دوٹوک جملہ بلکہ حملہ مجھے اچھا لگا''۔

وہ کچھ دیر خلا میں یوں ہی ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر یوں ٹھہر ٹھہر کر گویا ہوا۔

''میں جب سیکنڈ لیفٹیننٹ بنا تو میرے والدین کی خواہش تھی کہ وہ میری جلد سے جلد شادی کر دیں۔ پھر ایک دن اچانک ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی...... میں نے اس کا پتا ٹھکانا بھی ڈھونڈ

نکالا...... مگر پھر انکشاف ہوا کہ اس کا تو نکاح ہو چکا ہے...... رخصتی ہونے والی ہے...... زندگی میں کوئی پہلی بار مجھے پسند آیا تھا...... مگر کیا کیا جا سکتا تھا...... کچھ نہیں......''

زبیر کہتے کہتے ٹھہر گیا۔ نفیسہ خاموشی سے سن رہی تھی۔ اردگرد کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے پتے خاموش تھے۔ حتیٰ کہ فضا میں بھی سکوت چھایا ہوا تھا۔ خاموشی اس قدر گہری تھی کہ دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنوں کی آوازیں بھی سن سکتے تھے۔

مگر اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ نفیسہ جس نے اب تک خود ساختہ تناؤ اوڑھ رکھا تھا وہ ڈھلکتا ہوا نیچے آنے لگا۔ وہ زبیر کے کہے ہوئے جملوں پر غور کر رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کا بھی نکاح پہلے ہوا تھا اور رخصتی بعد میں۔ اس نے زبیر کے آئینے میں خود کو کھڑا کر کے دیکھا۔ مگر وہاں کوئی تصویر نہ ابھر سکی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے سوچا۔ وہ کوئی اور ہوگی۔ پھر لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرانے لگے۔

''کبھی کبھی کسی غم کو بھلانے کے لیے لمحے درکار ہوتے ہیں...... اور کبھی کبھی کئی سال بھی کم پڑ جاتے ہیں...... میں نے بھی کئی برس اس ایک ملاقات کو بھلانے میں لگا دیئے...... لیکن میں ابھی قید تنہائی سے رہا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مجھے ایک خبر نے ہلا کر رکھ دیا...... وہ لڑکی جسے میں نے چاہا تھا اس کا شریک سفر ایک حادثے میں اس دنیا سے چلا گیا''۔

یہ سنتے ہوئے نفیسہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے اندر کسی نے چیخ کر کہا۔ وہ کوئی اور نہیں تم ہو۔ صرف تم ہو۔ تب وہ اور مضطرب ہوگئی اور بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''یہ آپ کس کے بارے میں بتا رہے ہیں؟'' کیا میرے بارے میں۔ جب کہ میں اور آپ آج سے پہلے کبھی ملے بھی نہیں''۔

''لوگ سرسری ملاقاتوں کو یاد نہیں رکھتے اور کچھ لوگ ان سرسری ملاقاتوں سے اپنی پوری زندگی کا تانا بانا بن ڈالتے ہیں''۔

کیپٹن زبیر بھی یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ نفیسہ نے تناؤ اور کھنچاؤ کی چادر کو دوبارہ اوڑھنے کی کوشش کی مگر وہ تو سرک کر پیروں میں آ گری۔ اس نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور دھیمی چال سے پگڈنڈی کی طرف چل دی۔ زبیر بھی ساتھ ساتھ ہو لیا۔ چلتے چلتے نفیسہ نے سوال کیا۔

''اس لڑکی سے ہونے والی وہ سرسری ملاقات کون سی تھی؟''

زبیر نے الٹا سوال داغتے ہوئے کہا۔

''پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ ایک آدمی جس نے اپنی پوری زندگی کو محض ایک سرسری ملاقات کی یاد میں گوندھ رکھا ہو۔ اچانک ایک حادثے کی صورت میں ہی سہی مگر اسے یہ موقع میسر آ جائے کہ وہ اپنی باقی زندگی کو اس سے وابستہ کر لے تو کیا کوئی برائی ہے؟''

''آپ کے سوال کا جواب میرے سوال سے جڑا ہوا ہے۔ یہ تو میں سمجھ گئی ہوں کہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں میں ہوں۔ مگر وہ ملاقات کون سی ہے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''اچھا اگر میں آپ کو بتا دوں تو کیا پھر آپ مجھے یہ حق دیں گی کہ میں آپ کو آپ کے نام سے پکار سکوں؟''۔

نفیسہ نے استفہامیہ انداز سے کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے اب بھی میرے نام سے پکار سکتے ہیں۔ میں اسے کوئی برائی نہیں سمجھتی''۔

''میں صرف نام لینے کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس کا حق مانگ رہا ہوں''۔

نفیسہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی''۔

نفیسہ جواب تک اپنے والدین کے سامنے شادی سے انکار کرتی چلی آ رہی تھی۔ آج سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ وہ بہت حیران ہو رہی تھی کہ ایک شخص اسے اتنے برسوں سے جانتا ہے۔

اور وہ اس کو بالکل نہیں جانتی۔ اور اب جب کہ اس کے دو بچے ہیں وہ اب بھی اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ زبیر اس کے پاپا کے کہنے پر یا سماج میں دکھانے کے لیے کہ اس نے ایک بیوہ اور دو بچوں کو اپنایا ہے، وہ ہمدردی کے طور پر شادی کی خواہش نہیں رکھتا تھا بلکہ درحقیقت وہ اسے چاہتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ جب اشفاق چوہدری کے گھر کی زینت تھی زبیر کے دل میں شاید تب بھی اس کی محبت کا دیا روشن تھا۔ اس نے زبیر کی طرف دیکھا جو کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔

اب تک کی ملاقات میں اسے کیپٹن زبیر اچھا لگا تھا۔ مگر وہ اب بھی اس بات سے لاعلم تھی کہ زبیر اسے کب سے جانتا تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی مگر بار بار یہی سوال دہراتے ہوئے اسے خفگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

دور دور تک آسمان صاف تھا۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ آخری تاریخوں کا چاند کہیں کنڈلی مارے چھپا بیٹھا تھا۔ مگر تا حد نظر پھیلے ہوئے پہاڑوں کے بیچ وادی کی فضا روشن تھی۔ پیر چنا سی آنے والے سیاح اور مقامی لوگ ادھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ دونوں اسٹاپ سے خاصا دور نکل آئے تھے۔

دونوں خاموش تھے مگر کچھ سوچ رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالوں میں گم۔ ایک دن پہلے تک اجنبی تھے۔ گو کہ ابھی تک ایک دوسرے کو اچھی طرح جان نہ سکے تھے مگر اتنے اجنبی بھی نہیں رہے تھے۔ نفیسہ کی بد دلی کہیں فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اس میں اچانک یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔

یکا یک اسے ایک خیال آیا اور اس نے واپسی کا سفر اختیار کرتے ہوئے ایک جملہ زبیر کی طرف اچھال دیا۔

''میں آج بھی اشفاق سے محبت کرتی ہوں''۔

یہ سن کر زبیر نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا اور واپسی کے لیے خود بھی مڑتے ہوئے بولا۔

''کرنا بھی چاہیے''۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں؟''

''جی ہاں! اگر آپ یہ بات نہ کہتیں تو شاید میں آپ سے نہ پوچھتا۔لیکن اگر آپ اس کے الٹ کہتیں تو میں فوراً کہتا کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں''۔

زبیر نے یہ کہتے ہوئے نفیسہ کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں سادہ کاغذ کے سوا کچھ نہ تھا۔نفیسہ نے نہ کوئی وضاحت کی اور نہ اس سے مزید کچھ پوچھا۔دونوں آہستہ خرامی سے چلتے رہے۔تھوڑی دیر بعد زبیر دوبارہ گویا ہوا۔

''جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔اور ہم سب ان سے ہمیشہ محبت کرتے رہتے ہیں۔اور اگر ہم ایسے لوگوں کو بھلا دیں تو پھر ہم اپنے ہی برے ہونے کا ثبوت دیں گے''۔

نفیسہ نے زبیر کی طرف دیکھا۔وہ اسے اچھا لگا۔اڈا قریب آ گیا تھا جہاں محب، نوشین، عزیر، اریبہ اور بچے نظر آ رہے تھے۔ان دونوں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔سب نے معنی خیز نظروں سے دیکھا مگر خاموش رہے۔

(۷)

اگلی صبح سورج کی چمکتی کرنوں سے وادی کا ذرہ ذرہ روشن تھا۔ بادلوں کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ دھوپ نے سبزے کو نکھار دیا تھا۔ ایک طرف اخروٹ اور بادام سے لدے درختوں دوسری طرف چیڑ اور دیودار کے بلندوبالا درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ بھیڑ بکریاں اللہ کی زمین پر پھیلے ہوئے سبزے میں اپنی غذا تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔

سب لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ اور اب برآمدے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ کیپٹن زبیر صبح ہی اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ بابا شیر دل تمام مہمانوں کی خدمت میں مصروف تھا۔ خواتین اس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں لیکن وہ ان سے بار بار یہی کہے جا رہا تھا کہ یہ میرا کام ہے۔ میری ڈیوٹی ہے۔ آپ تو پانچ افراد ہیں اگر بیس بھی ہوں تو مجھے کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ مگر اریبہ اور نوشین کو بوڑھے کشمیری پر حد درجہ رحم آ رہا تھا کہ کس قدر محنت سے وہ تمام مہمانوں کی خدمت گزاری میں جتا ہوا

ہے اور ذرا پریشانی یا تھکاوٹ کا اظہار نہیں کر رہا۔

بوڑھا شیر دل دو برس قبل فوج سے بحیثیت اردلی ریٹائر ہوا تھا۔ وہ اپنی ملازمت کے آخری برسوں میں کیپٹن زبیر ہی کی خدمت پر مامور رہا۔ اپنے گھر اور کنبے کی طرف سے مطمئن اور مسرور۔ اس کے بچے برسر روزگار تھے۔ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کا مالک تھا جہاں سبزیاں اگائی ہوئی تھیں۔ بچے شادی شدہ تھے اس کے گھر کا آنگن چھوٹے بڑے کئی پوتا پوتیوں سے بھرا ہوا تھا۔

ریٹائرمنٹ کے کچھ ہی دنوں بعد اس نے محسوس کیا کہ اگر وہ یوں ہی چارپائی توڑتا رہے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ پھر شیر دل نے کیپٹن زبیر کے ہاں آنا شروع کر دیا۔ کبھی گھر کی چیزوں کی دیکھ بھال کر دیتا، کبھی پودوں اور کیاریوں کو درست کر جاتا۔ ایک بار وہ کیپٹن زبیر کے گھریلو کام سے کراچی بھی ہو آیا۔ یوں رفتہ رفتہ بوڑھے ریٹائرڈ شیر دل نے زبیر کی خدمت گزاری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اسے اس گھر میں عزت ملی تھی۔ گھر کے فرد کا رتبہ ملا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے بھی کیپٹن زبیر کی بہت عزت کیا کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے آنے والے جمعہ کے دن کی دعوت کہلوائی تھی۔ اس دن بابا شیر دل کی دو پوتیاں پہلا روزہ رکھ رہی تھیں۔ اس بات کا قطعی امکان موجود تھا کہ بدھ کو رمضان کا چاند ہو جائے گا اور جمعرات کو پہلا روزہ ہوگا۔ مگر محب، نوشین اور نفیسہ دونوں میں کشمیر گھوم پھر کر اسلام آباد واپس جانا چاہتے تھے۔ تاکہ روزے وہیں رکھ سکیں۔

ناشتے کی میز پر یہی موضوع چھڑا ہوا تھا۔ عزیر اور اریبہ بضد تھے کہ یہ لوگ ابھی رکیں اور کچھ روزے ان کے ساتھ گزاریں۔ نفیسہ نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''سحری اور افطار کا سارا انتظام میں کرتی ہوں۔ امی اور پاپا تو پریشان ہو جائیں گے۔ اور ویسے بھی کل شام تک ہم اچھا خاصا مظفر آباد گھوم پھر لیں گے''۔

''دوڑتے بھاگتے ہوئے تو آپ ایک دن میں بھی گھوم پھر سکتے ہیں اور تفصیل سے دیکھیں

تو ہفتہ بھی کم پڑے گا''۔

اریبہ نے مزید کہا۔

''بات کل شام تک کی نہیں ہے۔ بات تو بابا شیر دل کی پوتیوں کی روزہ کشائی میں شرکت کی ہے''۔

پھر اس نے بوڑھے ملازم کی طرف رخ کرتے ہوئے ازراہ تفنن کہا۔

''بابا کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ان بچوں کو روزہ کل رکھوا دیں؟''

بابا شیر دل نے سادگی سے جواب دیا۔

''آپ بھی مذاق کر رہی ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے ابھی تو چاند بھی نہیں ہوا پہلی تراویح بھی نہیں ہوئی۔ دراصل جمعہ کا دن مبارک ہوتا ہے۔ اس لیے جمعہ طے کیا تھا اب وہ پہلا روزہ ہو دوسرا ہو یا تیسرا۔ آپ لوگ ہماری خوشی میں شریک ہونے کے لیے جمعہ تک رہ جاؤ۔ آپ لوگوں کو ہمارے چھوٹے چھوٹے گھروں میں بہت مزہ آئے گا''۔

میز سے برتن سمیٹتے ہوئے وہ مزید بولا۔

''گاڑی تیار ہے۔ ابھی آپ لوگ جاؤ، گھومو پھرو، دریائے نیلم، قلعے، اسمبلی بلڈنگ دیکھو، بازار میں شاپنگ کرو، کشمیر کی سوغاتیں خریدو، پھر شام کو آؤ آپ کو بہترین کھانا تیار ملے گا''۔

سب نے محسوس کیا کہ ان کے انکار سے بوڑھا ملازم اُداس ہوگیا ہے۔ شہر سے آئے ہوئے لوگوں کو کس قدر محبت اور اپنائیت سے اپنے گھر بلوانا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ بڑے شہروں کے ان رہنے والوں کو ان کے رکھ رکھاؤ اور معیار کے مطابق بٹھانے کا بندوبست بھی نہیں کر سکے گا۔ مگر اس کی معصوم خواہش تھی کہ وہ انہیں اپنے گھر بلائے۔ کیپٹن زبیر، عزیرا اور اریبہ نے اس کے ہاں آنے کا وعدہ پہلے سے کیا ہوا تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ نفیسہ اور بچوں کے آنے کے بعد صرف ایک دن میں پورے گھر میں سرگوشیاں کرتی ہوئی آوازوں نے بوڑھے ملازم کو بتادیا

ہے کہ برسوں سے کیپٹن زبیر کی اُداس اور بجھی بجھی آنکھوں کے رستے اس کے دل کے نہاں خانوں میں کون اترا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر میں جیپ فراٹے بھرتی ہوئی مظفرآباد اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی وادیوں اور پہاڑوں کے درمیان انسانی ہاتھوں سے تراشی ہوئی بل کھاتی سڑکوں کی اترائیوں اور چڑھائیوں پر رواں دواں تھی۔ پیچھے بھاگتے ہوئے منظر سامنے سے قریب آنے کے باوجود قریب نہ ہونے کا احساس دلاتے ہوئے بلند و بالا پہاڑوں کے درمیان یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کتنا سفر طے کرلیا اور کتنا باقی ہے۔

دریائے نیلم کے کناروں پر مدمقابل سفید قلعہ اور کالا قلعہ اپنی عظمت رفتہ کی داستان سنانے کے لیے اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے ان قلعوں سے عروج و زوال کے نہ جانے کتنے قصے وابستہ ہیں۔

سیاح یہاں کچھ دیر ٹھہر کر تاریخ کے ورق پلٹتے ہیں اور حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ راہداریوں میں گھومتے پھرتے ہوئے شاہی خاندان اور چک خاندان کے عظیم حکمرانوں اور ان کے تاریخی فیصلوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ آج کے عہد کے لوگوں کو ماضی کا یہ سفر مبہوت کر ڈالتا ہے۔ مگر وائے حیرت کہ جیسے ہی اپنے عہد میں لوٹتے ہیں ماضی کا یہ کچا سا تعلق یکا یک توڑ ڈالتے ہیں۔

جیپ کا ڈرائیور پڑھا لکھا اور مقامی تھا اور اسے مظفرآباد اور آس پاس کی سیاحتی جگہوں کے بارے میں نہ صرف علم تھا بلکہ ان کے تاریخی پس منظر سے بھی تھوڑا بہت واقف تھا۔ لہذا وہ ان مقامات کے بارے میں معلومات بھی فراہم کرتا جا رہا تھا۔

اس دوران عزیر کا کیمرہ بھی مسلسل حرکت میں تھا۔ خاص مقامات کی فلم بندی اور اس میں اریبہ، محب، نوشین نفیسہ اور بچوں کو کرداروں کی طرح فٹ بھی کرتا جا رہا تھا۔ آپس کی نوک جھونک سے وہ تفریح کو دوآتشہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ ایک موقع پر محب نے نفیسہ کو نشانہ بناتے

ہوئے نوشین سے کہا۔

''نوشین! گھڑی دیکھو۔ ہم اب اس وقت سے لے کر پینتالیس منٹ تک ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل رہیں گے لیکن ایک دوسرے سے بات نہیں کریں گے۔ اس دوران جو بولے گا وہ ہار جائے گا''۔

''مگر کیوں بھئی۔ نا بابا نا میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ اور وہ بھی پورا پون گھنٹہ۔ امپاسبل''۔

''میں یہ ایکسپریمنٹ کرنا چاہتا ہوں''۔

''بھئی جو جیتے گا وہ آئس کریم کھلائے گا''۔

عزیر نے درمیان میں کودتے ہوئے کہا۔

''آئی ایگریڈ''

''لیکن میں خاموش نہیں رہ سکتی۔ میں ہنڈریڈ پرسنٹ ہار جاؤں گی''۔

''تو کیا ہوا۔ آئس کریم کھلا دینا......بس''۔

نفیسہ جواب تک خاموش تھی اور محبّ کی حرکت کو خوب سمجھ رہی تھی نے کہا۔

''تم ایسا کرو کہ مجھ سے شرط لگاؤ''۔

''کیوں؟ میں آپ سے کیوں شرط لگاؤں۔ اپنی بیوی سے لگاؤں گا''۔

''میں تمہاری شرارت کو سمجھ رہی ہوں''۔

''میں نے کون سی شرارت کی ہے؟''

حیرت کے تاثرات چہرے پر بکھیرتے ہوئے محبّ نے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہا۔

''آپ میں سے کوئی مجھے یہ بتائے گا کہ میں نے کیا شرارت کی ہے؟''

سب نے مسکراتے ہوئے ایک ساتھ گردن نفی میں ہلائی۔

شام تک سب ہنستے مسکراتے لوٹ آئے۔کیپٹن زبیر گھر آ چکا تھا۔سب باہر لان میں بیٹھ گئے۔تھوڑی دیر میں بابا شیر دل چائے لے آیا۔

دیر تک سب بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ دن بھر کی روداد اور مزے مزے کی باتیں ایک دوسرے سے شیئر کرتے رہے۔اس دوران نفیسہ اور زبیر نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو مخاطب نہیں کیا۔دونوں کے چہروں پر رات کی گفتگو کا شائبہ تک نہ تھا۔یہ دیکھتے ہوئے محبّ نے دل ہی دل میں سوچا کہ کمال کے لوگ ہیں۔لگتا ہے دونوں پون گھنٹہ اجنبیوں کی طرح ہی ٹہل کر آئے ہوں گے۔

سب کے چہروں پر تھکن سجی ہوئی تھی۔اس لیے سب رات کا کھانا کھا کر جلدی سونے چلے گئے۔رات کے کسی پہر زبیر کی آنکھ کھل گئی۔اس نے دیکھا کہ برآمدے میں روشنی ہورہی ہے۔ گھڑی کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے۔اس نے سوچا ہوسکتا ہے بابا بلب بند کرنا بھول گیا ہوگا۔ وہ اس خیال کے تحت اٹھا کہ جا کر روشنی گل کردے مگر برآمدے میں آ کر اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ وہاں نفیسہ اکیلی بیٹھی ہوئی کسی رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی۔ دروازے کی ہلکی سی آہٹ پر اس نے گردن گھما کر دیکھا۔زبیر کو دیکھتے ہی اس نے رسالہ رکھ دیا اور کھڑی ہوگئی۔زبیر نے کہا۔

''آپ بیٹھیے میں تو بس یونہی برآمدے میں روشنی دیکھ کر بلب بند کرنے چلا آیا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ جاگ رہی ہیں''۔

''بچوں کو سلا کر خود سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند نہیں آئی تو یہاں آ کر بیٹھ گئی۔آئیے آپ بیٹھیے۔

''میں گہری نیند نہیں سوتا ہوں۔ہلکی سی آواز یا روشنی سے بھی آنکھ کھل جاتی ہے۔''

زبیر یہ کہتے ہوئے قریب آ گیا اور قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بچے آپ کے دونوں بہت پیارے ہیں"۔

"دراصل دونوں اپنے فادر پر گئے ہیں۔اشفاق بھی بہت اچھے تھے۔صورت اور سیرت ہر لحاظ سے"۔

نفیسہ نے ایک بار پھر بات کا رخ اپنے مرحوم شوہر اشفاق کی طرف موڑ دیا۔یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ گفتگو کو اسی سرے سے جوڑنا چاہتی ہے جہاں اس نے کل چھوڑی تھی۔یا پھر وہ زبیر کو بار بار ایک بات باور کرانا چاہتی ہے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر سے آج بھی بہت محبت کرتی ہے۔کل زبیر نے اپنی گفتگو کو بہت خوبصورت موڑ پر ختم کیا تھا۔بلکہ اپنے رویے اور سوچ سے بھی یہ مہر تصدیق ثبت کی تھی کہ وہ اخلاقی طور پر بلند اور دوسروں کی عزت کرنے والا انسان ہے۔نفیسہ نے اس بات کو محسوس کیا تھا اور وہ کل کی ملاقات سے یہ بھی جان چکی تھی کہ زبیر کے جسم و جاں میں محبت کی ان دیکھی ڈور کے دوسرے سرے پر کوئی اور نہیں وہ خود ہے۔مگر وہ اس ان دیکھی ڈور سے کب بندھی یہ اب تک نہ کھلا تھا۔

دوسری طرف زبیر نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ نفیسہ گفتگو جان بوجھ کر اشفاق کے حوالے سے کرتی ہے۔اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور پھر بولا۔

"اشفاق صاحب کرتے کیا تھے؟"

"ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی لوکل برانچ کے چیف تھے"۔

"چیف؟ آپ کا مطلب چیف ایگزیکٹیو۔وہ تو بہت بڑی پوسٹ ہوتی ہے"۔

"جی ہاں"

نفیسہ نے فخر یہ کہا۔

"یقیناً اشفاق کے پاس کوئی پروفیشنل ڈگری ہو گی؟"

زبیر نے اشفاق سے متعلق ایک اور سوال داغ دیا۔

’’پروفیشنل ڈگری تو نہیں تھی۔البتہ ان کے والد جس سیاسی پارٹی سے تعلق......‘‘

نفیسہ کہتے کہتے رک گئی۔اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے مرحوم شوہر کا ایک کمزور پہلو سامنے آنے والا ہے وہ اس کمزور پہلو سے واقف تھی۔وہ جانتی تھی کہ اشفاق کے والد ایک ایسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس کے لیڈر اکثر مفادات کی خاطر بکتے رہے ہیں۔اور یہ داغ اس کے سسر کے ماتھے پر بھی لگا ہوا تھا۔اسے معلوم تھا کہ اشفاق کو یہ ملازمت میرٹ پر نہیں ملی تھی۔ بلکہ یہ سسر کی سیاسی وابستگی تبدیل کرنے پر بیشتر انعامات میں سے ایک انعام تھا۔نفیسہ نے اپنے ادھورے جملے میں چھپی ہوئی خجالت کو محسوس کیا۔ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی کہ زبیر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’ہمارے ہاں کے سیاسی لوگ اچھے ہو جائیں تو بہت ساری خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔اور میں جب دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت سارے اشفاق جیسے اچھے لوگوں کو اپنے بڑوں کی بری سیاست پر قربان ہونا پڑتا ہے‘‘۔

زبیر نے نفیسہ کے ادھورے جملے سے معنی اخذ کرتے ہوئے بات کو کچھ اس طرح سے گھمایا کہ نفیسہ گنگ ہو کر رہ گئی۔اس کے پاس اشفاق کے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔یقیناً وہ اس کا شوہر تھا۔ایک اچھا اور نفیس شوہر جس سے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔اس کی یادیں تھیں جس کے سہارے وہ کئی برس گزارتی چلی آئی تھی۔وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اب زبیر جان بوجھ کر اشفاق کا ذکر کر رہا ہے۔ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ زبیر نے کہا۔

’’اشفاق کو جنہوں نے مارا ہو سکتا ہے وہ اس کے والد کو قتل کرنا چاہتے ہوں اور غلطی سے اشفاق کو نشانہ بنا دیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مارنے والے اس کے والد کو تنبیہ کرنا چاہتے ہوں۔ کیونکہ جس طرح آپ بتاتی ہیں کہ وہ بہت نفیس انسان تھا تو میں پورے یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ مارنے والے اشفاق کے دشمن بہر حال نہیں تھے۔نفیسہ! ہم اچھے لوگوں کی یادوں کے

سہارے پوری زندگی گزار سکتے ہیں۔ مگر یادوں کی پوٹلی اتنی بڑی ہو کہ اسے جب جب کھولیں اس میں سے نئی چیز، نیا واقعہ، یا پھر کوئی نیا رنگ ملے جس سے کچھ دن یا کچھ لمحے ہی سہی مگر ہم اپنی زندگی کو منور کر سکیں''۔

یہ کہتے ہوئے زبیر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''خاصا وقت ہو رہا ہے۔ اب آپ سو جائیے''۔

زبیر نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ پھر وہ یکا یک پلٹا اور کہنے لگا۔

''اوہ! آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر آپ کا نام لے لیا تھا''۔

اس اثنا میں نفیسہ بھی کھڑی ہو چکی تھی۔ مگر خاموشی سے زبیر کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

(۸)

اریبہ نے کچن میں قدم رکھا تو وہاں دو کشمیری بچیوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ مبہوت ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

پہاڑی حسن سادہ اور معمولی لباس میں سے جھلک رہا تھا۔ چمکتی روشن ستارہ آنکھوں میں بے پناہ معصومیت اور شرارت دو دریاؤں کے ملاپ کی طرح یکجا ہو گئی تھیں۔ آٹے کی لوئی جیسا رنگ، نرم و نازک جلد پر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ریشمی بال رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے چٹیلوں میں گندھے ہوئے تھے۔ دونوں شیر دل کے اطراف منڈلا رہی تھیں۔ اریبہ کو دیکھتے ہی یکدم رک گئیں اور سہم کر دیکھنے لگیں۔

اریبہ ان کے ملکوتی حسن کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ بابا کی پوتیاں ہوں گی۔ جن کا ذکر وہ کئی بار کر چکا تھا۔ اور شاید یہی بچیاں اپنا پہلا روزہ بھی رکھنے والی تھیں۔ اریبہ مسکرانے

لگی۔اسے مسکراتا دیکھ کر دونوں بچیوں کا خوف کم ہوگیا اور ان کے معصوم لبوں پر تبسم بکھر گیا۔

اریبہ نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ادھر آؤ''۔

وہ دونوں جھجکتے ہوئے قریب آ گئیں۔ پہلے دادا کو دیکھا اور پھر گھبراہٹ میں اپنے ہونٹوں کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے اریبہ کو دیکھنے لگیں۔اور پھر اریبہ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے جیسے ڈر جاتا رہا ہو۔اریبہ نے پوچھا۔

''تم دونوں کے نام کیا ہیں؟''

''کلثوم فاطمہ''

''کلثوم کون ہے اور فاطمہ کون؟''

''میں کلثوم''۔

بڑی بچی نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اریبہ نے پوچھا۔

''کون سی جماعت میں پڑھتی ہو؟''

''تیسری''

دونوں نے پھر بیک وقت جواب دیا تو اریبہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ بڑی بھی تیسری میں اور چھوٹی بہن بھی تیسری میں''۔

''وہ جی! کلثوم پچھلے سال بیماری کی وجہ سے فیل ہوگئی تھی''۔

بوڑھا شیر دل درمیان میں بول اٹھا۔

''ان کی ماں نے ان دونوں کو بھیجا ہے۔وہ کہتی ہے کہ بچوں کی بات کوئی نہیں ٹالتا''۔

''یہ دونوں اتنی پیاری ہیں کہ انہیں دیکھ کر میں حیران ہو رہی ہوں''۔

''بس جی! دونوں اپنی ماں پر گئی ہیں''۔

''ہوں! تمہیں پتا ہے ہمارے گھر میں بھی دو پیارے پیارے بچے ہیں......دیکھو گی؟''

دونوں نے گردن ہلائی۔

''بس ابھی اٹھنے والے ہیں۔تم دونوں ان کے ساتھ خوب کھیلنا۔اور ہاں......ان دونوں کو تم اپنے گھر لے جانے کی ضد بھی کرنا۔پھر ان کی امی تمہاری روزہ کشائی میں ضرور آئیں گی...... سمجھ گئیں؟''

دونوں نے ایک بار پھر اقرار میں گردن ہلا دی۔

تھوڑی دیر میں چاروں ایسے کھیلتے پھر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے پہچانتے ہوں۔دالان اور اس کے سامنے والے باغیچے میں اودھم مچ گیا تھا۔

کل شام زبیر نے بچوں کے لیے گیند، کرکٹ بیٹ، فٹ بال اور دیگر کھلونے بازار سے منگوا کر دیئے تھے۔اس وقت چاروں بچوں کے ہاتھوں میں وہی کھلونے تھے۔دالان کے سامنے والا باغ کرکٹ کا گراؤنڈ بنا ہوا تھا۔اور تمام افراد صبح کی پر کیف ہوا میں تازہ دم ہو کر بھرپور ناشتہ اور چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے ماسوائے نفیسہ کے۔جس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر سو نہیں سکی ہے۔

پچھلی رات زبیر کو خدا حافظ کہنے کے بعد کمرے میں جا کر اس نے سونے کی بہت کوشش کی مگر یادوں کی پوٹلی ایسی کھلی کہ پھر بند ہی نہ ہو سکی اور وہ اشفاق چوہدری کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک پل کو جھاڑ جھاڑ کر پھیلاتی رہی، دیکھتی رہی، اوڑھتی رہی۔

جب پوٹلی خالی ہو جاتی تو اس کے ذہن و دماغ پر زبیر کے جملے ہتھوڑے کی طرح برسنے لگتے جو اس نے رات کو چلتے ہوئے کہے تھے۔اور وہ ایک بار پھر ایک ایک پل ایک ایک ساعت کو دوبارہ دہرانے لگتی۔مگر اسے تھوڑی ہی دیر میں یہ احساس ہونے لگتا کہ اس کے پاس اشفاق

چوہدری کی یادوں کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے۔ وہ حیران تھی کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ اسے یہ بہت اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اشفاق کی موت کے بعد اس کی یادوں کے سہارے کئی برس گزارے ہیں اور دونوں بچوں کو پالا ہے۔ مگر آج وہ برسوں پر پھیلی ہوئی یادیں صرف ایک رات سے بھی چھوٹی کیوں پڑ رہی ہیں۔ کیا یہ اس جملے کا اثر ہے جو زبیر نے پچھلی رات چلتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اچھے لوگوں کی یادوں کے سہارے پوری زندگی گزار سکتے ہیں مگر یادوں کی پوٹلی اتنی بڑی ہو کہ اسے جب جب کھولیں اس میں سے نئی چیز، نیا واقعہ یا پھر کوئی نیا رنگ ملے جس سے کچھ دن یا کچھ لمحے ہی سہی مگر ہم اپنی زندگی کو منور کر سکیں۔

اسی کشش و پنج میں کروٹ بدلتے ہوئے اور بے خوابی کا عذاب سہتے ہوئے اسے گھنٹوں بیت گئے۔ کھڑکی کے شیشے پر صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی اترنے لگی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ خالی ذہن سے کمرے کی دیواروں کو تکتے ہوئے اسے دالان میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ باغ میں زبیر صبح کی ہلکی ورزش میں مصروف تھا۔ نفیسہ اسے دیکھتے ہوئے رات کی گفتگو پر غور کرنے لگی۔ اور پھر خیال کی رو میں اس کے اندر ایک آواز گونجی۔

نفیسہ یہ شخص تجھ سے محبت کرتا ہے۔ تجھے چاہتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ خود بخود سرشاری میں نہاتی چلی گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک اور نفیسہ اس کے اندر سما گئی جس نے کچھ برسوں سے اس کے جسم و جان پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ جو اسے بار بار یہ احساس دلاتی رہتی تھی کہ اس کی خوشیوں اور مسرتوں کا دور ختم ہو چکا ہے۔ وہ پلٹ آئی اور دھم سے بستر پر گر گئی۔ مگر نیند تب بھی اس سے کوسوں دور تھی۔

اس وقت بھی اس کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بے خوابی سے سوجی ہوئی تھیں۔ ساری رات جاگنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا مگر وہ رات بھر اپنے دماغ کے دروازے پر پرانی یادوں کی پوٹلی سے یادیں ٹٹولنے کے لیے دستک دیتی رہی تھی۔ اس لیے اب بوجھل پن کا

احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ وہ چائے پی چکی تھی مگر اسے اب بھی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر خود ہی کچن کی طرف چلی گئی۔

بوڑھے شیر دل بابا نے اسے آتا دیکھ کر سلام کیا اور بولا۔

''قدرت بھی کیسا کیسا کام کرتی ہے۔ ابھی میں سوچتا تھا کہ آپ کو کچن میں کیسے بلاؤں۔ اور دیکھو آپ خود یہاں چلا آیا''۔

''آپ کو مجھ سے کوئی کام تھا؟''

''جی ہاں! صبح صاحب نے جاتے ہوئے یہ آپ کو دینے کے لیے کہا تھا''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ جیب سے نکال کر نفیسہ کی طرف بڑھا دیا۔ نفیسہ نے اسے کھولا۔ اندر چند سطریں خط شکستہ میں تحریر تھیں۔

''آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔ مجھے یہ حق تو حاصل نہیں بس ایک درخواست ہے کہ اگر کوئی عذر مانع نہیں ہو تو دو دن اور رک جائیے۔ صرف دو دن''۔

نفیسہ نے رقعہ کو پڑھا اور مٹھی میں دباتے ہوئے بابا سے کہا۔

''بابا مجھے ایک کپ گرم سی چائے بنا دو''۔

''بی بی صاحب ابھی لو۔ میں آپ کو دس طرح کی چائے بنا کر پلا سکتا ہوں۔ کشمیری، ایرانی، دیسی، ادرک، چینی۔ کیپٹن صاحب میری قدر نہیں کرتے ہیں''۔

بابا نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو نفیسہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے کیوں؟''

''سردی میں سوپ بنا کر دیتا ہوں تو پینا بھول جاتے ہیں۔ چائے دیتا ہوں تو ٹھنڈی کر کے پیتے ہیں۔ کھانا بھی بس ایسے ہی کھاتے ہیں۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے...... اور بس''۔

نفیسہ ہنسنے لگی۔ بابا شیر دل جو زبیر اور نفیسہ کے بے نام تعلق سے آگاہ تھا، نے مزید کہا۔

"بی بی صاحب، کیپٹن صاحب درویش آدمی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ملازم گرم سالن روٹی کھاتا ہے اور وہ ٹھنڈا۔ مگر وہ خوش رہتے ہیں۔ ان کے سینے میں دل نہیں نرم اسفنج کا گولا ہے۔ جو کسی بھی حالت میں سخت ہی نہیں ہوتا۔ صاحب اپنی کسی خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں تو بہت سادگی اور عاجزی سے کرتے ہیں۔ ورنہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں آپ حیران ہوں گی"۔

یہ کہتے ہوئے بابا نے کچن میں رکھی لوہے کی کرسی کو دیوار سے کھینچ کر درمیان میں کر دیا اور نفیسہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ ایک وعدہ کریں کہ کسی کو بتائیں گی نہیں اور صاحب کو تو بالکل بھی نہیں۔ ورنہ میری نوکری ختم ہو جائے گی"۔

"بابا تمہارے صاحب اتنے نرم دل ہیں اور پھر تمہاری نوکری ذرا سی بات پر ختم کر دیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ویسے بتاؤ کیا بات ہے میں کسی سے نہیں کہوں گی"۔

"ہم غریب لوگ بچوں کی روزہ کشائی کوئی دھوم دھام سے نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اپنے عزیر صاحب کا حکم تھا اس لیے یہ انتظام کیا ہے۔ دراصل سات اکتوبر کو کیپٹن صاحب کی سالگرہ ہے اور صاحب سالگرہ نہیں مناتا۔ تو عزیر صاحب نے سوچا کہ کسی بہانے سے اس دن کچھ تقریب ہو جائے تو انہوں نے مجھے بچوں کی روزہ کشائی ذرا اچھی طرح سے کرنے کو بولا اور خرچے کے لیے پیسہ بھی دیا"۔

"اچھا"۔

نفیسہ نے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ اس کی مٹھی میں دبا ہوا کاغذ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔ آج پانچ اکتوبر تھی۔ سات اکتوبر میں دو

دن باقی تھے اور زبیر نے اسے دو دن رک جانے ہی کی درخواست کی تھی۔ اسی اثنا میں گرم گرم چائے کا پیالہ دیتے ہوئے بابا شیر دل نے کہا۔

''بی بی صاحب! مہربانی کر کے آپ دو دن کے لیے رک جاؤ۔ ہفتے کو پنڈی چلے جانا''۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں یا آپ کے کیپٹن صاحب؟''۔

''کیپٹن صاحب کہاں بولے گا۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گا کہ ان کی سالگرہ ہے۔ عزیر صاحب نے جو بھی کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے اور وہ بھی پوری خاموشی سے''۔

نفیسہ نے چائے کا کپ بابا کو لوٹاتے ہوئے اٹھ کر کہا۔

''لیکن بابا آپ کے صاحب کو تو پتا ہے کہ ان کی سالگرہ آ رہی ہے''۔

''بی بی صاحب! وہ تو پتا ہوگا نا۔ آج کے دور میں کون ہے جو نہیں جانتا کہ اس کی سالگرہ کب ہوتی ہے''۔

نفیسہ مسکراتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ دوپہر تک اس نے عزیر اور اریبہ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ نہ جانے کس طرح اس کے اوپر چڑھا ہوا خودساختہ خول چٹختا جا رہا تھا۔ دو دن پہلے وہ مظفرآباد آنے سے انکاری تھی اور اب خود ہی دو دن مزید رکنے کے لیے تیار بھی ہو گئی تھی۔

اس دوران محبت کی شرارتیں نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی تھیں۔ نفیسہ کو ڈر تھا کہ وہ اسے ضرور تنگ کرے گا مگر وہ خاموش رہا۔ البتہ نوشین اس فیصلے سے خوش تھی۔ نفیسہ کو پورا یقین تھا کہ یہ سب سات اکتوبر کے بارے میں جانتے ہیں لہٰذا اس نے بھی خاموشی مناسب سمجھی اور انجان بنی رہی۔ بابا کی پوتیوں کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی اور سب کچھ آسانی سے طے ہو گیا۔ کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ اچھنبا کیوں کر ہوا۔ نفیسہ کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ کس بات نے اسے رکنے پر آمادہ کیا ہے...... چند سطروں نے...... سالگرہ نے...... بچیوں نے...... یا پھر کوئی اور............

واپسی کا پروگرام ملتوی ہونے کی خبر کیپٹن کو دوپہر تک مل گئی۔ وہ اپنی معمول کی ڈیوٹی سے

شام کو لوٹا۔ اندھیرا پھیلتے پھیلتے چاروں طرف رمضان المبارک کا چاند دکھائی دینے کی خبر پھیل چکی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو رمضان کی مبارک باد دی۔ اس دوران میں جب نفیسہ اور زبیر نے ایک دوسرے کو دیکھا تو زبیر کے چہرے اور آنکھوں میں تشکر کے جذبات صاف دکھائی دے رہے تھے۔

(۹)

دریائے نیلم پر لکڑی کے تختوں، بان اور موٹے گتھے ہوئے تاروں کی مدد سے بنا جھولتا ہوا پل عبور کرنے کے بعد اونچے اونچے درختوں سے گھرے ہوئے پہاڑوں پر دور تک پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آدھا کلومیٹر کی مسافت پر پگڈنڈی ڈھلوان کی صورت میں یوں اترنے لگتی ہے جیسے برقی تیز رفتار جھولوں پر عمودی چڑھائی چڑھنے کے بعد کھلونا ٹرین اچانک نیچے کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ انسانی قدموں نے ان رستوں کو ہموار سطح میں تبدیل کر دیا ہے۔ اچانک ایک گھاٹی عبور کرتے ہی راستہ ایک بار پھر برقی جھولوں کی طرح اوپر کی سمت آگے بڑھنے کا اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اب رستہ عمودی نہیں ترچھا ہے۔ بائیں طرف سرسبز پہاڑ دیودار اور ریڑھ کی عمدہ لکڑی والے درختوں کا تاج سر پر اٹھائے بادلوں کو چھوتا دکھائی دیتا ہوا اور دائیں طرف یہی پہاڑ زمین کی تہہ میں اترنے لگتا ہے۔ دور تک تہہ در تہہ بڑی سیڑھیوں کے چبوتروں کی طرح

ہموار قطعے مختلف اقسام کی سبزیوں اور اناج کی فصلوں سے لدے ہوئے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے کچے مکانوں کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ، بکریاں، گائے، بیل اور دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے بھینس تقریباً ہر گھر کے آس پاس دکھائی دے رہے ہیں۔

پگڈنڈی پر چڑھتے ہوئے یہ سارا منظر آنکھوں میں قدرت کے حسن کی دلفریبی اور جلوے بھر دیتا ہے۔ ابھی مسافروں کی آنکھیں سرشاری کے نغمے کی آخری لے پر نہیں پہنچیں کہ بابا شیر دل کا گھر سامنے آ جاتا ہے۔

گھر کے تمام افراد نے مہمانوں کو دور سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے سب ان کے استقبال کے لیے باہر موجود تھے۔ بابا کا بڑا بیٹا اقبال اس کی بیوی زینب ان کے تینوں بچے فاطمہ، کلثوم اور جاوید اقبال۔ دوسری بہو شہزادی اس کے دونوں بچے آصف دل نواز اور شائستہ اور بابا شیر دل۔

بابا شیر دل کا چھوٹا بیٹا دل نواز کراچی کے کسی ادارے میں ہیوی ڈیوٹی کرین ڈرائیور تھا۔ چھ چھ ماہ بعد گھر کا چکر لگایا کرتا تھا۔ اب بھی عید پر آنے والا تھا۔ البتہ بڑا بیٹا اقبال یہیں زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

بابا کا گھر وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں درمیانے سائز کے تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ تینوں کمروں کے آگے دالان بھی بنا ہوا تھا۔ کمروں کی دیواریں مٹی اور پہاڑی پتھروں سے اٹھائی ہوئی تھیں۔ چھت میں چیڑ کی لکڑی کی بلیاں اور سیمنٹ کے چوکے استعمال کیے گئے تھے۔ البتہ دالان میں درختوں کی چھال اور مٹی کا لیپ کیا گیا تھا۔ پانچ فٹ بلند دیوار سے صحن کا احاطہ کھینچا گیا تھا جس کا فرش چکنی مٹی کے لیپ سے سجا پورے صحن میں پھیلا ہوا تھا۔ صحن میں ایک طرف کچی مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا جس کے اردگرد کچھ ڈھکے ہوئے برتن رکھے تھے۔ جلتی ہوئی لکڑیوں

سے چولہا گرم تھا اور اس کے اوپر رکھے برتن میں کچھ پک بھی رہا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اوپر چھوٹا سا چھپر تنا ہوا تھا۔ صحن کے دوسری طرف کونے میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔ خاموشی سے جگالی کرتی ہوئی تمام دنیا و مافیہا سے بے خبر...... صحن کے عین درمیان میں نیم کا چھتنار درخت چاروں طرف سایہ پھیلائے ہوئے تھا جس کی بے شمار ڈالیاں اپنی آری نما پتیوں کے ساتھ اتنی نیچے جھکی آرہی تھیں کہ بابا کی چھوٹے قد کی بڑی بہو زینب بھی کبھی کبھی غسل کے لیے ہاتھ بڑھا کر ڈالی توڑ لیا کرتی تھی۔ بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کا درخت بھی ایستادہ تھا جس میں کچا اخروٹ بھرا ہوا تھا۔

دالان میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر سب بیٹھ گئے۔ نوشین اور اریبہ نے بچوں کے لیے لائے ہوئے تحفے زینب کے حوالے کر دیئے۔ افطار میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کیپٹن نے روزے سے پہلے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔

دونوں بہوئیں مہمانوں کو بٹھا کر اپنے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ بڑا بیٹا اقبال افطار کی تیاروں میں دونوں عورتوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ بابا مونڈھے پر بیٹھا عزیر اور محبّ کو اپنے اس گاؤں کے بارے میں بتانے لگا۔ تھوڑی دیر میں کمرے سے کلثوم اور فاطمہ نکل آئیں۔ پیچھے پیچھے دیگر بہن بھائی بھی تھے۔ دونوں بچیوں نے کڑھی ہوئی کشمیری فراک اور پاجامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ حرا اور طلال ان دونوں سے ایک روز پہلے ہی مانوس ہو گئے تھے۔ ذرا دیر میں دونوں ان بچوں میں گھل مل گئے۔ نفیسہ نے آگے بڑھ کر دونوں بچوں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے۔ اریبہ نے اپنے پرس میں سے بچوں کو چاکلیٹ دیئے اور نوشین نے بچوں میں ڈھیر ساری کینڈیز بانٹیں۔ اور علیحدہ رکھے ہوئے ان کے تحائف کی طرف اشارہ کیا۔ بچیاں تحائف کی طرف بھاگیں تو بابا نے ڈانٹا۔

''اوئے پاگلو! سلام کرنا نہیں آتا؟''

بچیوں نے اثبات میں گردن ہلائی تو بابا بولا۔

''تو پھر کرو''۔

اور پھر سب بچے سلام کرنے لگے۔ دور بیٹھی ہوئی دونوں بہویں اور بیٹا ہنسنے لگے۔

دیہاتی فضا میں ستھرا ماحول قرینے سے لپا پُتا ہوا گھر بابا کے گھر والوں کے سلیقے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

محبّ جو دیر سے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کے دلفریب مناظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کر رہا تھا، نے عزیر سے کہا۔

''ایسی حسین فضا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ بس یہیں رہ جاؤں۔ نہ ذہنی تھکاوٹ نہ کوئی بیماری اور نہ ہی کوئی اور پریشانی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم شہری زندگی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ بہت جلد یہاں سے اکتا جائیں گے۔ ہمیں وہی بھیڑ پسند ہے۔ وہی ٹریفک کا اژدھام، دن رات کا ٹینشن ہمارے نصیب میں لکھا ہوا ہے۔ اور وہی ہم چاہتے بھی ہیں''۔

''دراصل وہ زندگی ہمارے خون میں رچ بس گئی ہے۔ ہمیں شور میں جینا اور بھیڑ میں چلنا اچھا لگتا ہے''۔

عزیر نے مزید زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''اور اگر ہمیں اچھا نہ بھی لگے تب بھی ہم اسی ماحول میں رہنا چاہتے ہیں۔ یہ تو صرف ریسٹ اینڈ ریکریشن کا بہانہ ہے''۔

نوشین نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بابا! یہاں ہسپتال کتنے ہیں؟''

''بڑے چھوٹے بہت سے ہیں...... سی ایم ایچ ہے، کچھ پرائیویٹ کلینک بھی ہیں''۔

بابا نے جواب دیا تو نوشین نے محبّ سے کہا۔

''محب! کیوں نا ہم یہاں ایک ہسپتال قائم کریں؟''

''اچھا آئیڈیا ہے لیکن ابھی ممکن نہیں ہے۔اس کے لیے ہمیں کچھ برس انتظار کرنا ہوگا۔ ہمیں ایکسپیرینس اور سرمایہ دونوں درکار ہیں۔کیونکہ صرف جذبے سے کام نہیں چلے گا۔زمینی حقائق یہ ہیں کہ یہاں آپ خدمت کے جذبے سے کام کریں گے نہ کہ کمانے کے نقطہ نظر سے۔ لہذا آپ کو فنڈز بھی درکار ہوں گے''۔

''سچ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں یہاں کام کروں''۔

پھر نوشین بجھے بجھے لہجے میں بولی۔

''لیکن تم ٹھیک کہتے ہو یہ دونوں چیزیں بہت ضروری ہیں''۔

پھر وہ یکا یک پر جوش لہجے میں کہنے لگی۔

''لیکن میں ایک بات کہہ رہی ہوں کہ اپنی زندگی میں یہاں یا پھر ایسے ہی کسی پہاڑی علاقے میں لوگوں کی خدمت کے جذبے کے تحت ہسپتال ضرور قائم کروں گی۔اٹس مائے پرامس''۔

اس دوران عزیر کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا وہ بابا سے پوچھنے لگا۔

''بابا! میں نے آپ کو جو چیز لانے کے لیے کہا تھا وہ لے آئے؟''

''جی ہاں صاحب! اندر رکھا ہے''۔

سب مسکرانے لگے۔نفیسہ نے استفہامیہ انداز سے دوسروں کو دیکھا تو قریب ہی بیٹھی ہوئی اریبہ نے سرگوشی میں اسے بتایا۔

''کیک''

نفیسہ بھی مسکرانے لگی۔پھر اس نے نوشین اور محب سے کہا۔

''تم دونوں پرامس کرو کہ یہاں ہسپتال چلاؤ گے۔سرمائے کی فکر چھوڑو۔وہ میری ذمہ

داری رہی‘‘۔

’’ارے بھئی لگتا ہے کہ میڈم کے پاس بہت پیسے ہیں‘‘۔

’’بہت تو نہیں ہیں مگر میں کرلوں گی۔تھوڑی بہت سیونگ کی ہوئی ہے۔کچھ پاپا سے لے لوں گی‘‘۔

اریبہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔

’’بھئی اس نیک کام میں ہمیں بھی شامل کرلیں‘‘۔

’’کیوں نہیں۔ہم ایسا کرتے ہیں کہ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔اسے رجسٹر کرواتے ہیں پھر اس کے تحت یہاں یا کوئی اور جگہ جہاں ہسپتال کی ضرورت ہو ایک ایسا ہسپتال قائم کیا جائے جہاں غریبوں کا مفت علاج کیا جاسکے‘‘۔

’’ایسے ہسپتال NGO چلاتی ہیں کیونکہ ان کے پاس فنڈز آتے ہیں مگر ہمارے پاس مسلسل فنڈز کہاں سے آئیں گے؟‘‘

محب،عزیر،اریبہ،نوشین اور نفیسہ کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی۔افطار کی تیاری ہو چکی تھی۔بابا بھی اپنے بیٹے اور بہوؤں کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو گیا تھا۔اسی دوران کیپٹن زبیر بھی پہنچ گیا اور گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔تھوڑی دیر میں افطار کا وقت ہو گیا۔کلثوم اور فاطمہ کو روزہ افطار کروایا گیا۔لیکن اس پورے اہتمام میں ایک بات کیپٹن زبیر نے محسوس کی تھی کہ وجہ اہتمام تقریب کی اہمیت پر زیادہ زور نہیں ہے۔یعنی کلثوم اور فاطمہ کی روزہ کشائی سے زیادہ یہ تقریب کچھ خاص مہمانوں کی دعوت کی صورت اختیار کرگئی ہے۔

آج دوسرا روزہ تھا۔پہلا روزہ ان لوگوں نے کیپٹن زبیر کے ساتھ مظفرآباد کے ایک ہوٹل میں افطار کیا تھا۔جہاں ماحول کو مصنوعی طریقے سے خوابناک بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔مگر آج بابا شیر دل کے گھر کا ماحول حقیقی فضا کی لپیٹ میں تھا۔جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اندھیرے کی چادر

دبیز ہوتی جارہی تھی۔

افطار کے بعد سب نے بابا شیر دل کی اقتداء میں نماز ادا کی اور اس دوران میں دستر خوان پر کھانا سجا دیا گیا۔ جسے دیکھ کر زبیر نے حیرت سے کہا۔

''بابا یہ کیسا انتظام کیا ہے آپ نے۔ یہاں نہ سادے پیازی چاول ہیں نہ مکئی کی روٹی نہ ساگ نہ دیسی گھی کی خوشبو''۔

''صاحب وہ تو ہمارا روز کا کھانا ہے۔ آج آپ لوگوں کے لیے کچھ خاص کر لیا ہے''۔

''آپ نے کچھ خاص نہیں بہت زیادہ کر لیا ہے۔ مجھے اگر پتا ہوتا کہ آپ یہ سب کریں گے تو میں منع کر دیتا''۔

زبیر کی باتیں سنتے ہوئے سب ایک دوسرے کو دبی دبی مسکراہٹ سے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف بابا شیر دل پریشان تھا کہ کہیں سچ منہ سے نہ نکل جائے کیونکہ اس نے کبھی اپنے صاحب کے سامنے نہ جھوٹ بولا اور نہ اسے بات کو گول مول کرنا آتا تھا۔ دوسری طرف بابا کی بہوئیں دستر خوان کے ایک طرف شرماتے ہوئے اپنی ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اور زبیر اس سب سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔

''ایسی فضا میں جہاں پورا ماحول گاؤں کا ہو وہاں پھسکڑا مار کر ساگ اور مکئی کی دیسی گھی میں چپڑی ہوئی روٹی کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ بابا آپ کو اتنا خرچہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب آپ ایک کام کیجئے کہ سارے خرچے کا بل آپ عزیر صاحب سے لیں گے''۔

''وہ میں دے چکا ہوں''

عزیر کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور دیر سے مسکراہٹ کو چھپانے اور دبانے کی کوشش کرنے والے سب ہنسنے لگے۔

''مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اور کیا کچھ کیا ہے آپ نے؟''

''کچھ نہیں بس میٹھے کے طور پر کیک منگوایا ہے''۔

''ہوں! ویسے اس گھناؤنے جرم میں اور کون کون شامل ہے؟''۔

محبّ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''سزا انہیں ملے گی جنہوں نے یہ جرم کیا ہے یا انہیں جو اس میں شامل نہیں ہیں۔ اگر اس کی وضاحت ہو جائے تو ہم ابھی بتا دیتے ہیں کہ کون شامل ہے اور کون نہیں''۔

زبیر نے اندازہ لگایا کہ اب اسے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تاکہ نفیسہ کو ٹارگٹ بنائیں۔ لہٰذا اس نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ میٹھے میں ہمیں کیک کھلا دیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ اور ویسے بھی اگر عدالت لگائی تو پھر صبح یہیں ہو جائے گی''۔

''ویسے بھائی جان ایک شب یہاں گزار کر دیکھتے ہیں۔ یہاں سکون دیکھیں کتنا ہے۔ اور مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے قدرت کی بنائی ہوئی ایک ایک چیز یہاں پر سربسجود ہے اور اپنے بنانے والے کی عبادت میں مصروف ہے۔ خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ''۔

عزیر نے بات کا رخ بالکل ہی موڑ دیا۔ سب اس سے متفق تھے۔ واقعی اس وقت پستی سے بلندی تک نگاہ ڈالنے سے عجیب وغریب دور تک گہرائی میں ڈوبے ہوئے سکوت اور سناٹے میں چھپی ان دیکھی بزرگی، ہوا کی طرح پھیلی ہوئی مگر نظر نہ آنے والی عظمت اور چاروں طرف پھیلے ہوئے بلند و بالا پہاڑوں پر سر اٹھاتے ہوئے طویل قامت درختوں سے زیادہ باوقار جلال کی نشانیاں پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ رات دھیرے دھیرے گہری ہوتی جارہی تھی۔

بابا شیر دل نے اپنی بہو کو کیک لانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر میں بڑا آرڈر پر بنا ہوا اسپیشل کیک لا کر درمیان میں رکھ دیا گیا۔ چند ساعتوں کے لیے چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا کرچی کرچی ہو گیا۔ سب نے تالیاں بجائیں اور ہپی برتھ ڈے ٹو یو کورس کی صورت میں گانے لگے۔ نفیسہ

خاموشی اور سنجیدگی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔اریبہ نے چھری آگے بڑھائی توزبیر نے کہا۔

''کیک میں نہیں وہ دونوں بچیاں کاٹیں گی جنھوں نے آج پہلا روزہ رکھا ہے۔آج کا دن توان دونوں کے نام ہونا چاہیے''۔

کلثوم اور فاطمہ نے خوشی خوشی کیک کاٹنے کی رسم ادا کی۔ان دونوں کی روزہ کشائی ان کی توقع سے زیادہ اچھی ہوئی تھی۔انہیں ڈھیر سارے تحفے ملے تھے۔عید سے پہلے عید جیسے نئے کڑھے ہوئے فراک پہننے کو ملے اور چاکلیٹ اور ٹافیاں بھی۔کلثوم اور فاطمہ کو دیکھتے ہوئے اریبہ نے نوشین سے کہا۔

''دونوں کتنی معصوم اور بھولی ہیں اوران فراکوں میں کتنی پیاری لگ رہی ہیں''۔

پھراریبہ نے باباشیر دل کی بڑی بہو کی طرف رخ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ فراکوں پر کڑھائی تم نے خود کی ہے؟''۔

اس نے چھوٹی بہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہزادی نے کی ہے''۔

''ہوں!شہزادی تم تو بہت ماہر ہو''۔

باباشیر دل کا بڑا بیٹا اقبال جو بہت دیر سے بس خاموش لیکن مسکراتے ہوئے لپک لپک کر کام کرتا پھر رہا تھا،نے کہا۔

''یہ ہمارے چاچا کی اکلوتی بیٹی ہے۔اس نے بارہویں تک پڑھا ہے۔یہ کالج کے بہت سارے مقابلوں میں حصہ لیتی تھی اور اول آتی تھی۔یہ نعتیں بہت اچھی پڑھتی ہے اور کڑھائی بنائی میں تو سمجھو کہ ماہر کاریگر ہے۔شادی کے بعد سارے شوق تو ختم ہو گئے اب بس کڑھائی بنائی کر لیتی ہے''۔

''باجی آپ اس کے ہاتھ کی چیزیں دیکھیں گی نا تو بس حیران رہ جائیں گی،کپڑے،تکیے،

چادریں، میز پوش، تغرے، اور رومال بھی"۔

بڑی بہو زینب نے کہا۔

بھئی دکھاؤ گی تو ضرور دیکھیں گے"۔

نوشین نے جواب دیا۔

"باجی آپ لوگ میرے کمرے میں چلیں میں آپ کو دکھاتی ہوں"۔

شہزادی نے نوشین اریبہ اور نفیسہ سے کہا۔

"ہاں، ہم وہاں چل کر بیٹھتے ہیں"۔

خواتین نے جواب دیا۔ زبیر نے پیچھے سے کہا۔

"کیا واپس نہیں چلنا ہے؟"

"میرا دل تو اُدھر جانے کو چاہ رہا ہے"۔

عزیر نے گھر کے دائیں طرف پہاڑی کے دامن میں ایک بلند ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خواتین کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

"جناب والا! یہاں جنگلوں میں خطرناک جانور بھی ہوتے ہیں"۔

زبیر نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ تو اقبال نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں صاحب! آس پاس میں کوئی خطرناک جانور نہیں ہے۔ ہاں جن پہاڑوں پر آبادی نہیں ہے وہاں کہیں کہیں ہوتے ہیں۔ ہم اس ٹیلے پر تو اکثر چلے جاتے ہیں۔ اس وقت چاندنی رات نہیں ہے۔ ورنہ چاندنی رات میں یہ سارے پہاڑ ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں"۔

"آج کچھ خاموشی زیادہ ہے یا روز ایسا ہی ہوتا ہے؟"

محبّ نے اقبال سے پوچھا۔

"صاحب آج کچھ زیادہ خاموشی ہے۔ کبھی کبھی ہوتی ہے۔ ویسے ادھر ڈھلان کی طرف بابا

کے ایک بچپن کے دوست کا گھر ہے ان کا ایک لڑکا بانسری بہت اچھی بجاتا ہے۔رات میں اس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔آج اتفاق سے وہ بھی خاموش ہے۔شاید رمضان ہیں اس لیے......"۔

"بات وہی ہے کہ ہمارے کان شور کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم یہاں کی اصل نیچر میں اپنے شہروں کی پر شور زندگی کو تلاش کر رہے ہیں"۔

زبیر نے کہا۔اس اثنا میں شہزادی کے کمرے سے نوشین اور اریبہ نکلیں۔اریبہ بولی۔

"بابا آپ کی چھوٹی بہو تو بہت ذہین، سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے۔مجھے تو اس سے گفتگو کر کے بہت حیرت ہو رہی ہے۔بے چاری شام سے ہماری خاطر مدارات میں لگی ہوئی ہے۔اب جو باتیں کی ہیں تو پتا چلا ہے کہ وہ کتنی خوبیوں کی مالک ہے"۔

بابا شیر دل مسکرانے لگا۔پھر نوشین محبّ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

"یہ زینب اور شہزادی ضد کر رہی ہیں کہ آج رات ہمارے ہاں رکیں۔اور یہ دیکھیں...... شہزادی نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے کتنے خوبصورت غلاف اور دوسری چیزیں ہم تینوں کو تحفے میں دی ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے جن میں کڑھے ہوئے کپڑوں کی خوبصورت کشمیری سوغاتیں تھیں۔اریبہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ بچیاں بھی ہمیں بہت روک رہی ہیں۔سب یہی کہہ رہے ہیں کہ آپ لوگ ہمارے ہاں روز روز تھوڑا ہی آئیں گے۔اب بتائیں کیا کریں؟"

"بی بی جی! یہ اتنے پیار سے کہہ رہی ہیں تو رک جائیں۔ان کا دل رہ جائے گا"۔

بابا شیر دل نے بھی ایک عرضی آگے بڑھا دی۔کیپٹن زبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لیں آپ لوگ۔مجھے تو واپس جانا ہے"۔

عزیر نے محبت سے کچھ کہنے کے لیے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسی اثنا میں ہوا کے دوش پر بانسری کی آواز سنائی دی۔ وادی میں کہیں کوئی بیٹھا بانسری پر میٹھا سا گیت الاپ رہا تھا۔ مدھر آواز خاموشی کی دبیز چادر کو چیرتے ہوئے راستہ نکال رہی تھی۔ عزیر نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''بھئی میں تو آج یہاں سے کہیں نہیں جا رہا''۔

پھر اس نے اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اقبال! کیا یہ لڑکا یہاں آسکتا ہے؟''

''ہاں جی آجائے گا''۔

''دوست اس لڑکے کو بلا کر لاؤ اور......''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے محبت سے سوال کیا۔

''آپ تو میرا ساتھ دیں گے نا؟''

''آف کورس''۔

پھر محبت زبیر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''زبیر صاحب! یقین مانیے گا کہ میں اس وقت زندگی کے حسین ترین تجربے سے گزر رہا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی سحر انگیز فضا کبھی نہیں دیکھی''۔

''ٹھیک ہے پھر آپ لوگ موج مستی کریں میں چلتا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے کیپٹن زبیر اٹھ کھڑا ہوا۔ بابا شیر دل نے کہا۔

''صاحب! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں''۔

''نہیں بابا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صبح آجانا''۔

''نہ جی آپ کو سحری میں مشکل ہوگی''۔

''چلیں جیسے آپ کی مرضی''۔

یہ کہتے ہوئے دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

(۱۰)

آہستہ خرامی سے رات نے آخرکار اپنی منزل کو پا ہی لیا۔ اس نے دھیرے دھیرے چاروں طرف پھیلی ہوئی اپنی سیاہ چادر کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ پورے کروفر کے ساتھ آنا اور تھکن کے ساتھ لوٹ جانا اس کا روز ہی کا معمول ہے۔ مگر آج جاتے ہوئے اور سورج کے ہاتھوں میں صبح کی کرنوں کا علم تھامے ہوئے دیکھ کر اس نے بڑی حسرتوں سے وادی پر نظر ڈالی۔ جہاں زندگی آہستہ آہستہ بیدار ہو رہی تھی۔ یوں بھی سرسبز پہاڑوں کی اس سرزمین پر جہاں بادل سروں پر نہیں بلکہ پیروں تلے تیرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ زندگی سورج کی پہلی کرن کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہے۔ نیم پختہ دیواروں کے پیچھے دھویں کے مرغولے فضا میں چاروں طرف اُڑتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ گھروں میں چولہے جل اٹھے ہیں۔ ہر گھر میں سحری کر کے روزے کی نیت فجر میں ہی کر لی گئی ہے۔ لیکن بچے اسکول کا سادہ یونیفارم پہنے ہوئے ماؤں، بھابھیوں، یا بڑی

بہنوں سے ناشتہ طلب کر رہے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنے اپنے کاندھوں پر علم و فن سے بھری کتابوں، کاپیوں کا بوجھ لٹکائے کچے پکے پہاڑی راستوں، ڈھلوانوں، پگڈنڈیوں سے ہنستے کھیلتے کودتے پھاندتے اپنے اپنے اسکولوں میں چلے جائیں گے۔

مزدور پیشہ لوگ روزگار کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکل کر شہری آبادیوں، بازاروں کی طرف رواں دواں ہیں کہ زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تلاش رزق بہت ضروری ہے۔

یہ روز کا منظر ہے۔

آج آٹھ اکتوبر کی صبح بھی پچھلی سینکڑوں صبحوں کی طرح اُجلی اُجلی اور نِکھری نِکھری طلوع ہوئی ہے۔ جھرنے بھی اسی طرح بہہ رہے ہیں۔ اخروٹ اور بادام کے درخت بھی روز کی طرح جھول رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے ہی سہی لیکن اب سورج بھی پوری طرح اپنی روشنی پہاڑوں، مکانوں، مرغزاروں، دریاؤں، آبشاروں، رستوں، پگڈنڈیوں، بازاروں پر پھیلا چکا ہے۔ رستوں پر اکا دُکا گاڑیاں بھی رواں دواں ہیں۔ بازاروں میں دودھ دہی، کتاب کاپی پنسل کی اور دوسری چھوٹی چھوٹی دکانیں کھل چکی ہیں۔

آج برکتوں کے مہینے کا تیسرا روزہ ہے۔ صبر و رضا اور یادالٰہی میں کثرتوں کی تیسری صبح ہے۔ اسی لیے زندگی کے تمام معمولات سے ذراہٹ کر اور کچھ زیادہ ہدایتوں اور نصیحتوں کی کتاب کی تلاوت کی بھی کثرت مسلمان گھروں میں دکھائی اور سنائی دے رہی ہے۔ کہیں کوئی بوڑھا عبدالقادر کہیں کوئی جوان عبداللہ کہیں کوئی بوڑھی خانم بی بی کہیں کوئی جوان حنیفاں اپنے رب کے بھیجے گئے پیغام کی تلاوت میں مصروف ہے۔

سب کچھ نارمل ہے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہے۔ وادی نیلم و جہلم کا ہر گاؤں روز کی طرح روشن و چمکتا ہوا ہے۔

بابا شیر دل کے گھر میں بھی صبح روشن اور چمکتی ہوئی اتری تھی۔ ساری رات جاگنے، بانسری پر

خوبصورت دھنیں سننے، اقبال کی آواز میں کشمیری اور انڈین گیت سننے، ایک دوسرے کو لطائف سننے اور سنانے اور پہاڑی کے دامن میں بلند ٹیلے پر جا کر مٹر گشت کرنے کے بعد عزیر، محبّ اور اقبال لوٹ آئے اور دوسری طرف معصوم اور بھولی زینب اور شہزادی کی دل موہ لینے والی باتوں، کشمیر کی ثقافت، یہاں کے قصے کہانیوں اور شادی کے رسم و رواج کی باتوں میں نوشین، اریبہ اور نفیسہ کا وقت کیسے کٹا کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ اور پھر رات کے پچھلے پہر بابا کی دونوں بہویں سحری کی تیاری میں جُت گئیں۔ سحری کے بعد سب کے چہروں پر تھکن کے آثار سر چڑھ کر بولنے لگے۔ اس دوران میں اقبال نے دو کمرے مہمانوں کے لیے صاف کروا رکھے تھے۔ تاکہ کچھ دیر یہ لوگ آرام کر سکیں۔

ذرا دیر میں سب نیند کی وادی میں گم ہو گئے۔ جس وقت ساری وادی بیدار ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس وقت نوشین، اریبہ، نفیسہ اور اس کے دونوں بچے ایک کمرے میں اور محبّ اور عزیر دوسرے کمرے میں خواب دیکھ رہے تھے۔

روشن اور امید افزاء خواب

محبت اور سرشاری

امنگوں اور جذبوں

آبشاروں اور جھرنوں کے خواب

خواب......خواب......اور بس خواب

زینب اور شہزادی بیدار تھیں اور معمول کے مطابق اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ رات بھر جاگنے کے باوجود ان کے چہروں سے تھکان کا ذرا احساس نہ تھا۔ شہزادی دالان میں مونڈے پر بیٹھی قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھی۔ گھر کی فضا آیات سے منور ہو رہی تھی۔ الہامی الفاظ ہوا کے دوش پر دور دور تک سفر کر سکتے تھے مگر ہوا تو ٹھہری ہوئی تھی۔ درختوں کے پتے،

ڈالیاں ساکت ہوگئیں تھیں۔ زینب نے سر پر چادر کو درست کرتے ہوئے دودھ کا برتن اٹھایا اور کونے میں بندھی ہوئی بھینس کے قریب چوکی پر جا کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے بھینس کے پچھلے پیروں میں رسی باندھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ بدک گئی اور زور سے اپنے پچھلے پیروں کو اچھالتے اور نصف دائرہ بناتے ہوئے گھوم کر زینب کو دیکھا۔

زینب گرتے گرتے جھنجھلائی۔

''کیا کرتی ہے''۔

اس اثنا میں دودھ کا برتن اوندھا ہوگیا۔ زینب نے اسے سیدھا کیا اور دوبارہ پیر باندھنے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ مگر بھینس تیار نہیں تھی۔ اس نے گردن میں بندھی رسی پر زور ڈالا۔ دائرے میں گھومتے ہوئے پہلی کوشش، پھر الٹی طرف پھرتے ہوئے رسی پر زور ڈالنے کی دوسری کوشش۔ مگر ناکام۔ جانور نے بے بسی سے زینب کو دیکھا۔ جو کہ سر پکڑے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''بھابھی ابھی کسے دودھ پینا ہے۔ شام کو دھو لینا''۔

شہزادی نے تلاوت کے درمیان کہا۔ زینب نے جواب دیا۔

''پر اس کلوٹی کو ہوا کیا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے زینب جیسے ہی اٹھی وہ چکرا کر گری۔ مونڈھے کا سہارا لینا چاہا تو وہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اسی اثنا میں نیم کے درخت پر بیٹھے ہوئے سارے پرندے شور مچاتے اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ شہزادی نے جلدی سے قرآن مجید کو سینے سے لگایا اور لکڑی کی بلی کا سہارا لیتے ہوئے توبہ استغفار کا ورد کرنے لگی مگر بلی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے لگی تھی۔ اس کا سر چکرایا وہ یکا یک خوفزدہ ہو کر اٹھی اور چیخ مارتے ہوئے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کی چھٹی حس نے احساس دلایا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اسے اپنے دونوں چھوٹے بچے یاد آئے جو کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ گھبرا گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"یا اللہ خیر"۔

ٹھیک اسی لمحے زمین ڈولنے لگی۔ آناً فاناً سب بکھرنے لگا۔ قدم لڑکھڑائے......زمین سرکی اور زینب کا جسم ایک بار پھر ڈول کر رہ گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بے اختیار اس کے حلق سے چیخیں برآمد ہونے لگی تھیں۔ بابا شیر دل کا مکان پہاڑ کے دامن میں واقع تھا اور صحن سے کمروں کی طرف دیکھنے سے کمروں کی چھتیں پہاڑ سے جڑی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ زینب کی آنکھوں کے سامنے پہاڑ ہل رہا تھا اور ان پہاڑوں پر صدیوں سے جمے ہوئے پتھر فضا میں کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح ادھر سے اُدھر اُڑ رہے تھے۔

سارا کھیل لمحوں کا تھا۔ بلکہ شاید لمحوں کے بھی ہزارویں حصے میں سب کچھ ہو رہا تھا۔ سارے کام ایک ساتھ ہو رہے تھے۔

خوف، دہشت، گھبراہٹ، زمین کی ابتری، پہاڑوں کا ہلنا، پتھروں کی بارش، زمین کی گڑگڑاہٹ، آسمان کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں تو کبھی بائیں۔ مٹی کی دیواریں ملبے کا ڈھیر ہو رہی تھیں اور کمرے......

الامان الحفیظ......

لکڑی کی بلیوں اور سیمنٹ کے چوکوں کی چھتیں لمحوں میں بیٹھتی چلی گئیں۔ وزن سے کمرے کی دیواریں چیخ گئیں اور ایک طرف بیٹھنے لگیں جس کی وجہ سے چھتیں بھی بیٹھتے بیٹھتے ایک طرف جھک گئیں جیسے کسی میز کے چاروں پائے ایک سمت میں ٹوٹ کر گر یں تو میز کی اوپر کی سطح دوسری سمت کو بیٹھ جاتی ہے۔

شہزادی دروازے کی چوکھٹ پار کر چکی تھی اور دروازہ چُر مُر کرتا ہوا چھت کے بوجھ تلے بیٹھتا چلا گیا۔ یہی حال دیگر دونوں کمروں کا ہوا تھا۔

روشن اور امید افزاء خواب دیکھنے والوں پر کیا قیامت گزری کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بیدار ہوئے

یا سوتے ہی رہ گئے۔ کچھ خبر نہیں تھی۔ نہ اندر والوں کو نہ باہر والوں کو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ بانسری کی لے پر خوبصورت نغمے سننے اور سنانے والے زندگی کا کڑا عذاب اور درد و الم کے نوحے تا قیامت سننے سنانے کے لیے اب اس دنیا میں ہیں بھی کہ نہیں۔ اگر معلوم تھا تو صرف اتنا کہ چیخیں ضرور بلند ہوئی تھیں۔ چیخیں تو شہزادی کے بچوں اور اس کی بھی سنائی دی تھیں لیکن زمین کی گڑگڑاہٹ، فضا میں پھیلا ہوا گرد و غبار جانوروں کی بے بسی کا نوحہ، پتھروں کی بارش نے مل کر چاروں طرف بکھرے ہوئے سکون کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اور جہاں قیامت کا ثور پھونکا جا رہا ہو، وہاں معصوم چیخیں سمندر میں بوندوں کی طرح ہوتی ہیں اس دوران ہر طرف سے ابھرنے والی آوازوں نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو ختم کر دیا تھا۔ جو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

سویا تو سوتے رہ گیا

بیٹھا تو بیٹھے رہ گیا

ٹھہرا تو ٹھہرے رہ گیا

حتیٰ کہ ان لمحوں میں تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ کیا کیا جائے اور اس قیامت سے بچنے کی کیا تدبیر کی جائے۔

سب کچھ تباہ ہوتے ہوئے دیکھ کر زینب پر وحشت طاری ہو گئی تھی وہ چیخ رہی تھی مگر کوئی مدد کرنے والا نہ تھا۔ شہزادی جو چند لمحے قبل اس کے سامنے بیٹھی تلاوت میں مصروف تھی اچانک کمرے کی طرف بھاگی تھی اور اب وہ کمرہ ملبے کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے دونوں کمروں میں شہر سے آئے ہوئے مہمان آرام کر رہے تھے۔ سو رہے تھے۔ انہیں تو موقع بھی نہ مل سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کمروں کی چھتیں بھی زمین بوس ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے ہنستے بولتے دس نفوس جن میں دو مرد چار عورتیں اور چار بچے تھے ملبے تلے دبے ہوئے تھے اور وہ بے بسی سے یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ ان بھاری سلوں اور

پتھروں کے نیچے کون کس حال میں ہے۔

یکا یک اسے خیال آیا کہ اس کا شوہر اقبال کھیتوں کی طرف گیا ہے اور اس کے تینوں بچے اسکول گئے ہوئے ہیں۔ زینب شہزادی کی طرح پڑھی لکھی نہ تھی بلکہ سیدھی سادھی دیہاتی عورت تھی۔ مگر اس قیامت انگیز تباہی کے مناظر اسے اتنا ضرور سمجھا رہے تھے کہ یہ تباہی صرف اس کے گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے وہ باہر کی طرف دوڑی۔ دروازے کی دہلیز پار کرتے ہوئے اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی بیٹیوں کلثوم اور فاطمہ کو جنہوں نے کل ہی اپنی زندگی کا پہلا روزہ رکھا تھا اپنے بیٹے جاوید اقبال کو جسے دیکھ کر اس کی ممتا ٹھنڈی رہتی تھی۔

اسی اثنا میں سامنے سے اقبال سرپٹ بھاگتا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے دور سے اپنے گھر کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور پھر زلزلے کی ان ساعتوں میں صرف اپنا گھر ہی نہیں وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے اس نے پہاڑوں، وادیوں کے چاروں طرف بکھرے ہوئے چھوٹے بڑے کچے پکے مکانوں کو آناً فاناً گرتے اور تباہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جس لمحے زمین خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہلی اس نے بے اختیار زمین کی طرف گردن جھکا کر اور چاروں طرف گھوم کر دیکھا کہ یکا یک ہوا کیا ہے۔ مگر ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ خوفناک اور کانوں کو پھاڑ دینے والی آوازوں کے شور میں توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ چاروں طرف مکان ملبے کا ڈھیر بننے لگے۔ پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر اور مٹی کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے کی طرف لڑھکنے لگے۔ چند سو گز کے فاصلے پر بہنے والے دریا کے شور میں اچانک اضافہ ہو گیا اور دہشت زدہ کر دینے والی چھپاک چھپاک کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی بلندی سے تیز رواں دواں پانی کے بڑے ریلے میں بھاری بھرکم چیزیں ڈال رہا ہو۔

چند سیکنڈوں کے اس ہیبت ناک زلزلے کے دوران وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب تو دیکھ رہا تھا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دیکھا کہ جہاں وہ کھڑا ہوا خوف سے کانپ رہا تھا اس سے صرف چند گز کے فاصلے پر زمین پر گہری اور کئی فٹ چوڑی دراڑ پڑ گئی تھی۔ وہ دہل کر رہ گیا۔ کیونکہ زلزلے سے صرف چند منٹ پہلے وہ ٹھیک اسی جگہ کھڑا ہوا پھاوڑے سے مٹی سمیٹ کر ڈھیری بنا رہا تھا۔ اور اب ذرا سی دیر میں اسی جگہ زمین کی گہری تہ میں اترتا ہوا شگاف منہ کھولے سب کچھ نگل جانے کے لیے بے قرار تھا۔

اقبال نے سر سے پیر تک جھرجھری لی اسے اچانک خیال آیا کہ اس کے گھر میں اس کی بیوی بھابھی، بچے اور کیپٹن صاحب کی فیملی کے لوگ ہیں اور دور سے اس کا گھر کسی کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔ وہ سرپٹ دوڑ پڑا۔ تب اس نے اپنی بیوی زینب کو گھر کے کھنڈر نما دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ زور سے چیخا۔

''بچے کہاں ہیں بچے؟''

زینب نے بدحواسی سے جواب دیا۔

''اس......اسکول...... ہاں اسکول میں''۔

''میں اسکول جاتا ہوں۔ تو ادھر دیکھ''۔

''میں کیا دیکھوں؟''

وہ بے بسی سے بولی۔ اقبال نے سنی ان سنی کی اور اسکول کی طرف دوڑ پڑا۔ زینب پلٹی اور ملبے کے ڈھیر کے قریب آئی۔ چھوٹے بڑے پہاڑی پتھروں کے اوپر پیر رکھتے ہوئے وہ چھت کے سلیب کے قریب آئی۔ اسے دروازے کی ٹوٹی ہوئی چوکھٹ کے درمیان ایک شگاف نظر آیا۔ وہ بے قرار ہوکر آگے بڑھی۔ پتھروں پر توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ مگر شگاف کے رستے جو امید جاگی تھی اس نے اسے ہمت دلائی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھی اور پکار کر کہا۔

''شہزادی......اوشہزادی''۔

کوئی جواب نہ ملا۔وہ بے قرار ہوگئی اور پھر پوری قوت سے چلاّئی۔

''شہزادی......آصف......شائستہ''۔

اس نے بچوں کو بھی آواز دی۔مگر تب بھی کوئی جواب نہیں ملا۔اس کا دھیان دوسرے کمروں کی طرف چلا گیا جہاں کیپٹن صاحب کے عزیز دبے ہوئے تھے۔وہ ننگے پیر ملبے پر رکھتے ہوئے آگے بڑھی اور برابر والے کمرے کی طرف آواز دی۔

''باجی جی! سُنتی ہو......میری آواز سنتی ہو، باجی جی! کچھ بولو''۔

اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔وہ چونکی اور لپک کر پتھر ہٹانے لگی۔زینب کو اس کمرے میں زندگی کے آثار دکھائی دیئے۔امید کی کرن جاگی۔اس کے اپنے اندر سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔کچھ پتھر اس کی طاقت اور بساط سے بھاری تھے۔اس نے انہیں لڑھکانے کی کوشش کی۔زینب کے ہاتھ مشقت کے ہاتھ تھے۔ہر مہینے صحن کی دیواروں اور دالان کے کچے فرش پر چکنی مٹی کا لیپ کرنے کی عادت نے اس کے ہاتھوں کو خاصا محنت مشقت کا عادی بنادیا تھا۔لیکن قیامت کی اس گھڑی میں اس کے ہاتھوں میں طاقت کسی اور ہی جذبے کے تحت آئی تھی۔مگر کب تک......یہ ہاتھ پھر بھی ایک عورت کے ہاتھ تھے۔وہ تھوڑی دیر میں ہانپ گئی۔کیونکہ دیوار کے پتھروں کے بعد اب چھت کے بھاری سلیب اس کے راستے میں آکر کھڑے ہوگئے تھے۔وہ ایک بار پھر زور سے چلائی۔

''باجی جی! آپ ہمت رکھیں......میں کچھ کرتی ہوں''۔

ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے زینب کو کچھ خیال آیا۔اس نے دوبارہ زور سے آواز دے کر پوچھا۔

''باجی جی! دوسری باجی جی اور بچے کیسے ہیں؟''

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ پوچھا مگر جواب ندارد۔اس بار کراہنے کی بھی

آواز سنائی نہیں دی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ابھی ایک کمرہ اور باقی ہے۔ ایک بار پھر پتھروں کو پھلانگتی ہوئی ملبے کے ڈھیر میں گمشدہ تیسرے دروازے کی طرف بڑھی ابھی اس نے آواز دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اسے لگا کہ کوئی ملبے کی جھریوں سے پکار رہا ہے۔

''اقبال......اقبال......کوئی ہے......ارے کوئی ہے؟''

''جی صاحب جی......میں میں زینب......آپ ٹھیک ہیں۔ میں کچھ کرتی ہوں''۔

زینب کے ہاتھوں میں ایک بار پھر پھرتی آ گئی اور وہ تیزی سے چھوٹے بڑے پتھروں کو دور پھینکنے لگی۔ زندگی کے ایک اشارے نے اس کے اندر برقی رو بھر دی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کمرے کی چھت کا سلیب ایک طرف سے کچھ اٹھا ہوا تھا۔ یہاں پڑے ہوئے پتھروں کو اس نے ہٹانا شروع کر دیا اور جگہ کو خالی کرنے لگی تا کہ راستہ بن سکے۔ زینب کے نسوانی ہاتھ اپنی بساط سے بڑھ کر کام کر رہے تھے۔ اس دوران اس کے ہاتھوں کلائیوں اور چہرے پر جگہ جگہ خراشوں اور چوٹ کے نشان پڑ چکے تھے اور کہیں کہیں خون بھی رس رہا تھا۔ مگر وہ اس تکلیف سے قطعی بے گانہ تھی۔ اسے اپنے درد کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ اپنے بچوں کو بھی بھول چکی تھی۔ اس نے سب کچھ خدا کے سہارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے سامنے تباہی اور بربادی کے خوفناک مناظر تھے۔ ایسی تباہی جس میں زندگی کی امید کم ہی کی جا سکتی ہے۔ اس کے سامنے بکھرے ہوئے تین کمروں میں سے دو کمروں میں موجود افراد سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن زندگی کے آثار وہیں سے مل رہے تھے اور جس کمرے میں اس کے دیور کی بیوی جو اسے اپنی چھوٹی بہن کی طرح پیاری تھی، وہ اور اس کے دو معصوم بچے دبے ہوئے تھے، وہاں سے زندگی کے کوئی آثار نہیں مل رہے تھے۔ مگر امید اور آس کی ڈوری ابھی ٹوٹی نہیں تھی کہ جب تک موت کی خبر نہ ملے آس باقی رہتی ہے۔ اسی لیے اب تک اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

خشک ایسے جیسی سوکھی بنجر زمین۔

اچانک وہ اپنے بچوں کے بارے میں سوچنے لگی۔ جن کی خبر ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ بے چین ہوگئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس طرف دوڑ جائے جس طرف اسکول ہے۔ جس میں اس کے تینوں بچے پڑھتے ہیں۔ ابھی تک اقبال بھی نہیں لوٹا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔

لیکن یہ سب سوچتے ہوئے اس کے ہاتھ رکے نہیں۔ وہ تیزی سے پتھر ہٹا رہی تھی اور سلیب کے نیچے جگہ بنا رہی تھی تا کہ وہ باہر نکلنے میں مدد دے سکے۔

مدد...... جو ایک انسان دوسرے انسان کی کرتا ہے۔

مدد...... جو رشتہ نہ ہوتے ہوئے رشتہ بنا دیتی ہے۔

مدد...... جو خدا کی صفات میں سے ایک ہے۔

(۱۱)

کمانڈنگ آفیسر کے کمرے سے نکلتے ہوئے کیپٹن زبیر کے قدم اسٹور کی طرف مڑ گئے۔ وہ اسٹاک پوزیشن کے بارے میں پرچیز آفیسر سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا کمرا بیرکس کے پیچھے کی سمت بنا ہوا تھا۔ وہ کوریڈور سے گزرتا ہوا پیچھے کی طرف چلا گیا۔ ابھی اس نے اسٹور میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ اس کے قدموں تلے زمین درخت سے ٹوٹ کر گرتے ہوئے پتے کی طرح ڈولنے لگی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ صورت حال خطرناک ہے۔ وہ برق رفتاری سے کھلے حصے میں آ گیا۔ کوریڈور کی دو سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ لڑکھڑایا اور جھول کر زمین پر آ رہا۔ اس کا گرنا اچھا ہوا۔ وہ زمین سے چپک گیا اسے ایسا لگا جیسے وہ واٹر بیڈ کے گدے پر اوندھا لیٹا ہوا ہے اور واٹر بیڈ کا گدا پانی کے اوپر ہچکولے کھا رہا ہو۔

مگر اس دوران اس کے کانوں میں خوفزدہ کر دینے اور دل ہلا دینے والی آوازوں کی

گڑگڑاہٹ نے احساس دلایا کہ یہ زلزلہ ہے اور نہایت خوفناک حد تک پہنچے ہوئے ریکٹر اسکیل پر آیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انتہائی خوفناک تباہی آنے والی ہے۔ لیٹے ہوئے اس کا دایاں کان زمین سے چپکا ہوا تھا۔ اس کی سماعتوں سے جو آوازیں ٹکرا رہی تھیں وہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ آوازیں میدان کارزار میں رونما ہونے والی کسی حقیقی جنگ سے زیادہ بھیانک تھیں۔

پھر اسے لگا کہ زمین کا ہلنا بند ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ دھول مٹی میں اٹ گیا ہے۔ لمحے بھر کو کیپٹن ویسے ہی پڑا رہا اور آس پاس کی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے بھیانک خاموشی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سامنے کی تمام بیرکس زمین بوس ہو چکی تھیں اس نے پلٹ کر دیکھا وہاں بھی ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سامنے کوریڈور میں ایک سپاہی اور ایک سویلین ملازم کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ریتیلی زمین پر جس طرح وہ لیٹ گیا تھا دو اور سپاہی بھی لیٹے ہوئے تھے اور اب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی سب کچھ حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں قریب آئے۔ ایک نے کہا۔

''سر! یہ کیا تھا؟''

''ان ایکسپکٹیڈ''۔

پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا۔

''ہری اپ۔ چیک کرو جلدی۔ ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کو بچا سکیں۔ اینڈ یو''۔

اس نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

''وائرلیس روم چیک کرو میں میجر صاحب کو دیکھتا ہوں''۔

سپاہی نے سویلین اور گرے ہوئے سپاہی کو دیکھا لیکن وہ واقعی مر چکے تھے۔

''سر یہ مر چکے ہیں''

''وہاں دیکھو''

اس نے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ سپاہی سامنے والے بیرکس کی طرف دوڑ گیا۔ دوسرا سپاہی اتنی دیر میں لوٹ آیا۔

''سر وائرلیس روم تباہ ہو گیا ہے۔ اور ٹاور بھی گر گیا ہے''۔

''اوہ مائی گاڈ۔ اٹس مین وی کانٹ کمیونی کیٹ ٹو ہائی اپس اباؤٹ دس ڈیزاسٹر''۔

اس دوران دونوں سپاہیوں نے آپس میں کچھ کہا۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی بدحواسی دیکھ کر کیپٹن زبیر نے پوچھا۔

''اینی پرابلم؟''

''سر! ہماری فیملی''

''یہ امتحان کی گھڑی ہے۔ بٹ آف کورس۔ یو آر رائٹ، ہمیں اپنے گھروں کو بھی دیکھنا ہوگا''۔

''دونوں سپاہی مقامی تھے اس لیے پریشان تھے۔ کیونکہ چھاؤنی کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے دوسری طرف دور دور تک تباہی بکھری ہوئی تھی۔ اچانک کیپٹن زبیر کو یاد آیا کہ وہ خود بھی تو اکیلا نہیں ہے۔ اس کے گھر میں اس کے چھوٹے بھائی عزیر اس کی بیوی اریبہ کے علاوہ کچھ اور مہمان بھی ہیں۔ ڈاکٹر محب، ڈاکٹر نوشین اور نفیسہ۔

نفیسہ کا دھیان آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔

''اوہ مائی گاڈ۔ یہ سب لوگ پہاڑ پر ہیں اور پہاڑ......''

اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میجر کی طرف جانا بھول چکا تھا۔ چھاؤنی سے باہر کچھ فاصلے پر اسے جو مکان ملا ہوا تھا۔ وہ اسی طرف جا رہا

تھا۔ کیونکہ وہاں بابا شیر دل تھا۔ کیپٹن پہلے اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں تباہی اور بربادی کے آثار پھیلے ہوئے تھے۔ مکان، دکانیں اور تعمیرات زمین بوس ہو چکی تھیں۔ سڑک کے کنارے مسجد کی چھت اپنے تمام پلر اور دیواروں کو توڑتی ہوئی نیچے آ گئی تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ ہر ایک اپنے اپنے پیاروں کو دیکھ رہا تھا۔ کسی کو کوئی پھاوڑا بیلچہ یا لوہے کی سلاخ کی تلاش تھی تاکہ اپنے عزیزوں کو ملبے کے ڈھیر سے نکال سکے۔ کوئی چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ کہیں کوئی بچہ بلک رہا تھا۔ تو کہیں کوئی بوڑھا تڑپ رہا تھا۔ کہیں کوئی نوجوان زخم زخم ہوا کراہ رہا تھا۔ تو کہیں کوئی عورت بے بسی سے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

اس سارے منظر نامے میں جس سے جو بن پڑ رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ کوئی ہاتھوں سے ملبہ ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کوئی چھت کی سلیب کی موٹی سلاخوں سے پنجہ آزمائی کر رہا تھا۔ تاکہ انہیں توڑ کر راستہ بنا سکے۔ تو کوئی چیخ چیخ کر اپنے پیاروں کو دلاسا دے رہا تھا کہ جلد ہی وہ انہیں ملبے سے نکالنے کی سبیل کرے گا۔

کیپٹن زبیر نے تیز رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے یہ سارے مناظر پلک جھپکتے ہوئے دیکھے۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''صاحب! خدا کے واسطے میری بچی کو بچالو''۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک بوڑھی کشمیری عورت اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کے باہر کھڑی اس سے مدد طلب کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کیپٹن نے پوچھا۔

''کہاں ہے تمہاری بچی؟''

''صاحب...... یہاں...... دیوار کے پیچھے''۔

بوڑھی عورت نے اضطراری انداز میں ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''صاحب وہ زندہ ہے''۔

اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''صاحب میری بچی''

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زبیر ایک سپاہی تھا اسے اس بات کی ٹریننگ دی گئی تھی کہ مصیبت میں کس طرح خود پر قابو رکھا جاتا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر صورت حال کا جائزہ لیا اور وقت ضائع کیے بغیر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ دو موٹی موٹی لکڑیاں تھیں۔ اس نے دونوں لکڑیوں کو مکان کی گری ہوئی دیوار کے نیچے پھنسانے کی کوشش کی تاکہ ملبہ ہٹانے کی صورت میں دیوار مزید نیچے نہ گرے۔ وہ کسی حد تک لکڑیوں کو دیوار کے نیچے پھنسانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر ملبے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اسے ہٹانے لگا۔ لیکن ملبہ ہٹانے سے اٹکائی ہوئی لکڑیاں سرکنے لگیں۔ اس نے انہیں اور مزید اندر کر کے پھنسا دیا۔ تب اس کی نگاہ نیچے دبی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔

زبیر کٹ کر رہ گیا۔ لڑکی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی روح نے دیوار تلے دبے ہوئے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ زبیر نے بوڑھی عورت کو دیکھا جو ملبے سے ذرا دور بے چینی سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ماما کی بے قراری آنسو بن کر اُبل رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی زندہ ہے۔

کیپٹن زبیر نے اس عورت سے آنکھیں چرالیں۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بوڑھی عورت سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے اور اسے بتائے کہ وہ جس کے لیے بے چین ہے اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ کیپٹن زبیر نے جب نظریں نیچی کیں تو اس کے سامنے حسرت و یاس اور بے بسی سے کھلی ہوئی آنکھیں آ گئیں۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی ٹریننگ کہ مصیبت میں کس طرح خود پر قابو پاتے ہیں کچھ کام نہیں آ رہی تھی۔ وہ چھوٹے بڑے پتھر ہٹاتا رہا۔ بظاہر بوڑھی عورت کی نگاہ میں اس کی بیٹی کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور حقیقت میں وہ ایک لاش کو نکالنے کی سعی کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کیپٹن زبیر نے اکیلے ہاتھوں سے بھاری دیوار کے تلے اپنے ہاتھ پھنسا کر لڑکی کے کاندھوں تک پہنچائے اور آہستہ آہستہ اسے کھینچنے کی کوشش کی۔ کیپٹن نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کی عمر پندرہ سولہ برس رہی ہوگی۔

پہاڑی حسن...... گورا رنگ...... مگر بے جان جسم۔

لڑکی کے جسم پر کوئی خراش نہیں تھی۔ کیپٹن حیران تھا کہ پھر موت کس طرح واقع ہوئی۔ تب اس کی نگاہ لڑکی کی گردن پر پڑی جو کہ شاید کسی لمحے شدید جھٹکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اور گردن کا ڈھلکنا ماں نے دیکھ لیا۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔

''نہیں''۔

اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کیپٹن بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور گھٹی گھٹی سسکیوں سے رونے لگا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا...... کوئی بھی نہیں......

ہر طرف پھیلی ہوئی تباہی نے ہر بچ جانے والے انسان کو اپنے پیاروں کی لاشیں ڈھونے پر لگا دیا تھا۔ لیکن ابھی تو یہ آغاز تھا۔ گنتی ابھی تو شروع ہوئی تھی۔ ابھی تو بہت کچھ جمع تفریق کرنا باقی تھا۔

ابھی تو کچھ پتا نہیں تھا کہ انسانی رشتوں کے مضبوط اور خوبصورت جال کے نہ جانے کتنے تانے بانے ٹوٹنے کی خبر ملے گی۔ نہ جانے کتنے سلامت رہ پائیں گے اور نہ جانے کتنے زخم زخم دریدہ بدن زندگی کا عذاب جھیلنے کے لیے باقی رہ جائیں گے۔

ابھی واقعی بہت کچھ جمع تفریق کرنا باقی تھا۔

کیپٹن زبیر نے لڑکی کو ایک ہموار سطح پر لٹا دیا۔ بوڑھی عورت اس سے لپٹ گئی۔ کیپٹن پیچھے

سرک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ کیا اس عورت کو دلاسا دے یا پھر اس کے دیگر رشتہ داروں کو خبر کرنے میں اس کی مدد کرے۔ مگر بوڑھی عورت ہر طرف سے لاتعلق چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی۔ بین کر رہی تھی۔

کیپٹن زبیر نے اسے اکیلا چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ تھکے قدموں دور ہوتا چلا گیا کہ اسے یہی مناسب لگا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اس کے قدموں میں تیزی آ گئی اور وہ اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ روز کا ناپا ہوا راستہ پٹنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ شاید چاروں طرف پھیلے ہوئے کرب والم نے اس کے پیروں کو بھاری کر دیا تھا اور وہ قدم بڑھانے اور تیز تیز چلنے کے باوجود ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے چل ہی نہیں پا رہا ہو۔ آخر کار اس کا گھر دکھائی دینے لگا۔ اس نے دور سے ہی اندازہ لگایا کہ مضبوط اور پکی دیواریں بھی زلزلے کے مقابلے میں ناتواں ثابت ہوئی ہیں۔ اندر داخل ہوا تو پہلی نظر بوڑھے بابا شیر دل پر پڑی۔

وہ ٹھیک تھا۔ اسے زندہ دیکھ کر کیپٹن نے شکر ادا کیا۔ اور بولا

''بابا آپ ٹھیک ہیں؟''

''جی صاحب! جس وقت زلزلہ آیا میں یہاں کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ صاحب بہت خوفناک زلزلہ تھا''۔

بابا نے دہشت زدگی سے کہا۔

''تھوڑا سا میں نے باہر جا کر دیکھا ہے۔ یہ زلزلہ تو ہر چیز کو چاٹ گیا ہے''۔

''ان لوگوں کی کوئی خبر؟''

''صاحب آپ کے پاس سیل فون ہے۔ آپ اس سے رابطہ کرو''۔

''توبہ استغفار''۔

کیپٹن زبیر اپنے ماتھے پر انگلیاں مارتے ہوئے اور خود کو ملامت کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے ذرا دھیان نہیں ہے کہ میرے پاس رابطے کے لیے سیل فون ہے''۔

کیپٹن کے فون میں صرف عزیر کا نمبر تھا۔ اس نے بیل دی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے کئی بار کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے چین ہو گیا۔ بابا نے جو خود ہیجان میں مبتلا تھا، کیپٹن کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''صاحب! پریشان نہ ہوں۔ اللہ خیر کرے گا۔ سب ٹھیک ہوں گے''۔

''بابا ہم پہلے آپ کے گھر چل رہے ہیں۔ اسی وقت''

''لیکن صاحب یہاں گھر میں؟''

''یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا۔ باقی سب خیر ہے۔ سامان کے لیے کیا پریشان ہونا۔ ابھی راستے میں ایک معصوم بچی کی لاش اس کی ماں کے بازوؤں میں دے کر آرہا ہوں۔ اس وقت تو بابا صرف جانوں کی فکر کرو''۔

یہ کہتے ہوئے کیپٹن نے دوبارہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہنوز جواب ندارد۔

''آؤ بابا چلیں''

اس نے اچٹتی سی نظر گھر پر ڈالی۔ جس کا دالان مکمل طور پر زمین بوس ہو گیا تھا اور کمرے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ چھت پر بنا ہوا پانی کا ٹینک جس پلر پر ٹکا ہوا تھا وہ ٹیڑھا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ٹینک تقریباً معلق تھا اور کسی بھی وقت گر سکتا تھا۔ کمروں کی چھت کئی حصوں میں تقسیم ہو کر اِدھر اُدھر لٹک گئی تھی۔ اور دیواریں زیادہ بوجھ کے سبب لڑکھڑا گئی تھیں۔

کیپٹن زبیر نے وہی راستہ اختیار کیا جس پر وہ کل گزرا تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے لکڑی کا بنا ہوا پل جلدی قریب نظر آنے لگتا تھا۔ گھاٹی عبور کرنے کے بعد پہاڑ کے ساتھ ساتھ ایک طویل پگڈنڈی پار کرنا پڑتی تھی۔ یہی رستہ بار برداری کے جانوروں کے لیے بھی استعمال ہوا کرتا

تھا۔ عام حالات میں ان راستوں سے گزرتے ہوئے پہاڑوں کا حسن، ان کا جلال اور ان کا دبدبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا مگر اس وقت یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ سارے پہاڑ ڈھول اوڑھ کر ہر سمت پھیلی ہوئی تباہی پر ماتم کناں ہوں۔ اور لڑھکتے پتھروں اور مٹی کے تودوں کی صورت میں اپنا بدن نوچ رہے ہوں۔

ان پگڈنڈیوں کے آس پاس بھی آبادیاں تھیں۔ قریب ودور مکانات بنے ہوئے تھے۔ جو کہ اب کسی بھی صورت میں سلامت نہیں تھے۔ کہیں کم کہیں زیادہ لیکن تباہی اور بربادی ضرور مقدر کا لکھا بن کر ان کے گھروں، آنگنوں اور دالانوں میں پھیل گئی تھی۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ دھوپ چاروں طرف پہاڑوں، درختوں اور وادیوں میں نکلی ہوئی تھی۔ مگر روز کی چمک اور اس کا نکھرا پن دھول مٹی کی دھند میں مل کر ملیا میٹ ہو گیا تھا۔ بابا شیر دل کیپٹن کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کیپٹن زبیر کو ہر تھوڑی دیر بعد اپنی رفتار سست کرنا پڑتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب کیپٹن نے مڑ کر دیکھا تو بابا کو بہت پیچھے پایا تب وہ رک گیا تا کہ وہ قریب آ جائے کہ اچانک اس سے آگے صرف چند فٹ کے فاصلے پر اوپر پہاڑ کی بلندی سے کچھ حصہ ٹوٹ کر انتہائی تیز رفتاری سے نیچے کی طرف پھسلتا ہوا آنے لگا اور صرف چند ساعتوں میں چاروں طرف گرد وغبار پھیلاتا ہوا پگڈنڈی نما راستے پر آ کر گر گیا۔ بڑے تودے کے پیچھے پہاڑی مٹی مسلسل گرنے لگی۔ کچھ پگڈنڈی پر گرے ہوئے تودے پر گری اور کچھ مزید نیچے کی طرف پھسلتے ہوئے دریائے نیلم کے پانی میں شامل ہونے لگی۔ بابا شیر دل جو اس اثنا میں قریب آ چکا تھا بولا۔

''الاماں الاماں......صاحب ابھی کتنی قیامت دیکھنا باقی ہے''۔

''شاید بہت''

کیپٹن اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے رستہ بند ہو گیا۔ آگے بڑھنے

کے لیے بالکل راستہ نہیں تھا۔ لینڈ سلائیڈنگ کی بھربھری مٹی کے اوپر قدم رکھ کر پار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

کیپٹن نے بابا شیر دل سے پوچھا۔

''بابا! کوئی اور راستہ ہے؟''

''صاحب وہی رستہ جس سے میں آتا جاتا ہوں لیکن اب ہمیں واپس لوٹ کر جانا پڑے گا تب ہی اس راستے سے جا سکتے ہیں''

''آیئے''۔

کیپٹن زبیر نے کہا اور تیز تیز قدم آگے بڑھنے لگا۔

(۱۲)

انگریزی ادب میں پوزیشن کے ساتھ ماسٹر کرنے کے بعد ریاض احمد کے لیے لیکچرارشپ کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ اور ابتداء میں اس کا ارادہ بھی یہی تھا۔ مگر اسلام آباد میں ایک سیمینار اور ورکشاپ میں شرکت کے بعد وہ اپنے علاقے میں تعلیم کی صورت حال اور اچھے اسکولوں کی ضرورت کے بارے میں مسلسل سوچتا رہا۔ تب اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک اسکول قائم کرے گا۔ ایک ایسا معیاری اسکول جہاں نئی نسل کے بچوں کو اچھی تعلیم مگر نسبتاً کم فیس میں دی جائے۔ تاکہ کم آمدنی والے لوگ اپنے بچوں کو آسانی سے تعلیم دلا سکیں۔

آٹھ برس قبل ریاض احمد نے دو کمروں سے اسکول کا آغاز کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اسکول پورے علاقے میں پہچانا جانے لگا۔ جیسے جیسے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا کمرے بھی بڑھتے چلے گئے۔ لیکن فکری اور نظریاتی ذہن رکھنے والے ریاض احمد نے فیس بڑھانے کی رفتار کو

ہمیشہ دھیما ہی رکھا۔ پہلے چار برسوں میں طلبہ و طالبات کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ دس کمرے بھی کم پڑنے لگے۔ تب ریاض احمد ٹھیکیدار عاشق علی سے ملا جو کچھ عرصے سے ریاض کو بڑی جگہ پر اسکول میں پارٹنرشپ کی آفر کرتا رہا تھا۔

چار ماہ کے مختصر عرصے میں سولہ سترہ کمروں کا بڑا اسکول ٹھیکیدار عاشق علی نے تعمیر کر دیا۔ عمارت پہلے دن سے اس بات کی چغلی کھا رہی تھی کہ ٹھیکیدار عاشق علی نے سریے اور سیمنٹ کے استعمال میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لیا ہے۔

دورانِ تعمیر ایک بار ریاض احمد نے ازراہِ مذاق عاشق علی سے کہا۔

''عاشق بھائی یہ خیال رہے کہ ان کمروں کی چھتوں کے نیچے میں اور آپ بھی بیٹھیں گے''۔

تو عاشق علی نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''قسم پیدا کرنے والے کی ریاض صاحب! خاکسار یہاں سے لے کر کراچی تک سینکڑوں مکان تعمیر کر چکا ہے۔ آج تک کسی مکان میں سیوریج کی لائن تک لیک نہیں ہوئی ہے۔ آپ کسی سے بھی جا کر پوچھ لیں''۔

سن دو ہزار دو کا نیا سیشن نئی بلڈنگ میں شروع ہوا۔ اور پہلے برس میں ہی جب بچے کلاس روم کی دیواروں پر زور سے اپنا اسکیل رگڑتے تو دیوار میں گڑھی ہوئی ایک لکیر پڑ جاتی اور ریت کے ذرے فرش پر گرنے لگتے۔

نئی اور بڑی عمارت میں منتقل ہونے سے آس پاس کے لوگوں پر اچھا اثر پڑا۔ نئے سیشن میں داخلے بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہوئے۔ ریاض نے اس ترقی کا اثر زیادہ لیا اور نفسیاتی طور پر عمارت کی خامیوں کو نظر انداز کرتا چلا گیا۔

سن دو ہزار پانچ تک آتے آتے اسکول میں بچوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہو گئی صرف ان تین برسوں میں اور بھی بہت کچھ تبدیل ہوا تھا۔ ہوا یوں کہ جب باقاعدہ تحریری شکل میں ریاض

Scanned by CamScanner

احمد اور ٹھیکیدار عاشق علی اسکول میں پارٹنر بن گئے تو عاشق علی نے اپنی چھوٹی بیٹی رباب کو بھی اسکول میں انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے اسٹاف میں شامل کرلیا۔ رباب کے آنے سے ریاض کو بہت سارے کاموں میں سہولت ہوگئی۔ وہ نہ صرف دفتر کے بیشتر امور نبٹا دیا کرتی بلکہ اسکول میں ہونے والی غیر تدریسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ رباب کی وجہ سے اسکول کے طلبہ و طالبات میں مختلف نوعیت کے مقابلے بھی ہونے لگے۔ جس کا نتیجہ بہتر برآمد ہوا۔

اس دوران ریاض اور عاشق علی کے درمیان گھریلو تعلقات قائم ہوئے اور ایک دوسرے کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ عاشق علی نے ریاض کو ایک اچھا نوجوان پایا۔ اس نے چاہا کہ ریاض اس کا داماد بن جائے لہذا عاشق علی نے ریاض کے والد سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا جسے بغیر کسی تردد کے مان لیا گیا۔ اور چند ماہ میں ریاض کی شادی عاشق علی کی بڑی بیٹی مہہ جبیں سے ہوگئی اور اب مہہ جبیں امید سے تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ولادت متوقع تھی۔ لیکن سات اکتوبر کو اچانک طبعیت خراب ہونے کی وجہ سے مہہ جبیں کو شہر کے ایک پرائیویٹ کلینک میں داخل کرنا پڑا۔

آٹھ اکتوبر کی صبح معمول کے مطابق اسکول میں درس و تدریس کا آغاز ہوا۔ ریاض احمد ہمیشہ کی طرح دعا اور ترانے کے وقت دیگر اساتذہ کے ہمراہ موجود تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ طالب علموں کے کلاسوں میں جانے کے بعد وہ ہسپتال جائے گا۔

طالب علم حافظ مہتاب نے قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت کی۔ جب وہ سورۃ الرحمٰن کی اس آیت پر پہنچا۔

کل من علیها فان

ترجمہ: زمین پر جو ہیں سب فنا ہونے والے ہیں۔

تو بے ارادہ ریاض کی نگاہ سامنے کھڑے ہوئے سینکڑوں بچوں پر پڑی جو سر جھکائے کلام

الٰہی سن رہے تھے۔

ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

ترجمہ: صرف تیرے رب کی ذات جو عظمت اور عزت والی ہے باقی رہ جائے گی۔

ریاض کی نگاہ بچوں کے سروں پر سے گزرتی ہوئی سامنے ایستادہ پہاڑوں کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں ہریالی کی چادر نے پہاڑوں کی برہنگی کو ڈھانپ رکھا تھا اور ایک دن اپنے پورے کروفر کے ساتھ فنا ہونے والے تھے اور جو باقی رہنے والی ذات تھی وہ ان کو پیدا کرنے والے رب کی تھی۔

فبای الاء ربکما تکذبٰن

ترجمہ: پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ریاض نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ آنے والی کسی بھی گھڑی میں وہ باپ بننے والا تھا۔ وہ مضطرب تھا اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد مہہ جبیں کے پاس پہنچ جائے۔ اس کے دھیان میں مہہ جبیں اور اس سے ملنے والی خوشی رقصاں تھی۔ ترانہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا اسے یاد نہیں تھا۔ بچے جب ایک قطار کی صورت میں اپنی اپنی کلاسوں کی طرف جانے لگے تو اس نے رباب سے کہا۔

''تم یہاں دھیان دینا میں ہسپتال جا رہا ہوں''۔

''ریاض بھائی میں چلوں؟''

رباب نے پوچھا۔ تو وہ بولا۔

''ابھی تو کچھ پتا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں واپس آنا پڑے''۔

''ٹھیک ہے''

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئی اور دفتر کی طرف چلی گئی۔ ریاض نے اس کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہسپتال میں تھا۔ مہہ جبیں بیدار تھی قریب ہی مہہ

جبیں کی امی بیٹھی تھیں۔ڈاکٹر صبح معائنہ کر کے جا چکی تھی۔ڈرپ کی نالی بازو سے منسلک تھی۔مہہ جبیں ریاض کو دیکھتے ہی بولی۔

''آپ مجھے گھر لے چلیں۔یہ ڈاکٹر تو بس اپنے پیسے بنا رہے ہیں''۔

''کیوں کیا ہوا؟''

ریاض نے پوچھا تو عاشق علی کی بیوی اور مہہ جبیں کی امی نے جواب دیا۔

''بیٹا کچھ نہیں۔یہ تو پاگل ہے۔ڈاکٹر نے ابھی دوسری ڈرپ لگوائی ہے۔وہ کہہ کر گئی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ابھی یا پھر دوپہر تک درد بڑھ جائیں۔لہذا ایسے میں گھر جا کر خود کو سوائے ہلکان کرنے کے اور کیا کرو گی''۔

''امی مجھے ابھی کچھ نہیں ہو رہا۔کوئی درد ورد کی علامت نہیں ہے''۔

''تو چپ رہ۔تجھے کیا پتا''۔

''مجھے سب پتا ہے۔بچہ مجھے ہو رہا ہے اور مجھے ہی نہیں پتا''۔

''ہاں تجھے کچھ نہیں پتا۔ہم نے چار چار بچے پیدا کیے ہیں۔تو ایسے ہی بڑی نہیں ہو گئی''۔

ریاض ناشتہ دان رکھ کر ایک طرف بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔تمہیں اور مجھے واقعی کچھ نہیں پتا''۔

مہہ جبیں نے بے اعتنائی سے گردن ہلائی۔اس کی اس حرکت پر ماں بولی۔

''ایک تو تیرے اماں ابا نے بہت نخرے اٹھائے اور اب تجھے میاں بھی بہت زیادہ نخرے اٹھانے والا ملا ہے''۔

''کیا نخرے دکھا رہی ہوں میں؟''

اس نے اسی بے اعتنائی سے یوں پوچھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں کوئی نخرے وخرے نہیں دکھا رہی۔اور اگر کوئی میرے نخرے اٹھاتا ہے تو ٹھیک ہے۔اسی نوک جھونک کے دوران نرس اس

کمرے میں داخل ہوئی اور ایک رقعہ ریاض کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ سامنے میڈیکل اسٹور سے لے آئیں''۔

ریاض نے کاغذ پر ایک نظر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سڑک کے دوسری طرف میڈیکل اسٹور تھا۔ وہ سڑک پار کرنے لگا۔ بس اسی لمحے زمین کی تہ در تہ سطحوں میں دائروں کی صورت میں بڑھتی ہوئی لہروں کی چکر نے اپنی پوری طاقت اور دل ہلا دینے والی آوازوں کے شور میں سب کچھ تہ و بالا کرنا شروع کر دیا۔ وہ پلٹا چند ساعتوں میں اس کی نگاہ ہسپتال پر پڑی وہ ہکا بکا ہسپتال کے درو دیوار کو دیکھنے لگا جو بوڑھے ناتواں جسم کی طرح لرز رہی تھیں۔ لپک کر آگے بڑھنا چاہا تو چکر کھا کر گر پڑا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ صرف ساعتوں سے آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

شور کی آوازیں

پتھروں کے گرنے کی آوازیں

دیواریں کے ٹوٹنے چٹخنے کی آوازیں

چھتوں، مچانوں کے جھٹکوں سے زمین بوس ہونے کی آوازیں

شیشوں کے چکنا چور ہونے کی آوازیں

گاڑیوں کے ملبے تلے دبنے اور لوہے کی چادروں پر برسنے والے پتھروں کی آوازیں

انسانی چیخوں کی آوازیں

اتنی ساری آوازیں مل کر دہشت پیدا کر رہی تھیں۔ بازار کی اس سڑک پر ابھی معمول سے کم گاڑیاں اور لوگ تھے تاہم سڑک بالکل سنسان بھی نہیں تھی۔ جتنے بھی لوگ تھے سب زلزلے کی زد پر تھے اور اب صرف چند سیکنڈوں میں تباہی اور بربادی کے عجیب و غریب دہشت انگیز منظر نامے کے گواہ تھے۔ ریاض کو جسم سے ٹکرانے والے کئی چھوٹے بڑے پتھروں نے بیدار کیے رکھا تھا۔ اس

نے جب گردن اٹھا کر دیکھا تو ذرا دیر پہلے کی زندگی سے بھرپور سڑک موت کا کفن اوڑھے زمین پر مٹی کے ڈھیر کی صورت پڑی ہوئی تھی۔

وہ حواس باختہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔اس نے خود سے سوال کیا۔

''یہ سب کیا تھا؟''

اسے اپنے اندر سے خود ہی جواب ملا۔

''قیامت''

اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھند میں لپٹے خوف کی چادر سرکی تو سامنے ہسپتال نظر آیا۔ لوگ چیختے پکارتے بے ترتیب اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔اس نے اپنے حواس کو قابو میں کیا اور ہسپتال کی طرف دوڑا۔ہسپتال کی عمارت بھی دیگر عمارتوں کی طرح زخموں سے چور کھڑی ہوئی تھی۔خوبصورت شیشے کا دروازہ چکنا چور پڑا تھا۔اندر کی سمت چھت بیٹھ گئی تھی۔ریاض خوفزدہ ہوگیا۔وہ پڑھا لکھا ذہین اور سمجھ دار تھا۔چاروں سمت تباہی و بربادی دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ گوشت پوست کے انسانی جسموں پر کیسی تباہی اُتری ہوگی۔ریاض کے سامنے ملبے کے ڈھیر میں خود اس سے تعلق رکھنے والی تین نسلوں کی تباہی مقدر کا لکھا بنتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔وہ اس خیال سے کانپ کر رہ گیا۔اسے تھوڑی دیر پہلے اسکول میں حافظ مہتاب کی دہرائی ہوئی آیتیں یاد آنے لگیں۔

کل من علیها فان

زمین پر جو ہیں سب فنا ہونے والے ہیں

ویبقٰی وجه ربک ذوالجلال والاکرام

صرف تیرے رب کی ذات جو عظمت اور عزت والی ہے باقی رہ جائے گی۔

فبای الاء ربکما تکذبٰن

پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیات کی گونج اس کے جسم وجاں کے رگ و پے میں تیزی سے دوڑتی، دل و دماغ میں بھرے خیالوں کو چیرتی پھاڑتی گزرتی ہوئی اس کی آنکھوں میں اُتر آئی اور پوری شدت کے ساتھ آنسو بن کر بہہ نکلی۔ سب کچھ لمحے کے ہزارویں حصے میں ہوا اور وہ پور پور نہاتا چلا گیا۔ چند منٹوں میں ریاض کے اندر کی ساری گرد جھڑ گئی اور وہ پورے ہوش وحواس اور اعتماد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے کہ اگر مہہ جبیں اور امی کے نصیب میں موت لکھی ہے تو پھر کوئی نہیں بچا سکتا، میں بھی نہیں۔ اور اگر انہیں ابھی زندہ رہنا ہے تو کوئی نہیں مار سکتا۔ اس یقین نے اس کے اندر عجیب ولولہ پیدا کر دیا۔ اس کے اندر ایک ارادے کی گونج پیدا ہوئی۔

''مجھے اپنے حصے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آخری حد تک، خواہ نتیجہ کچھ بھی نکلے''

یہ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور ملبے کو پھلانگنے لگا۔ مہہ جبیں جس کمرے میں تھی وہ کمرہ عمارت کے بالکل پیچھے کی سمت بنا ہوا تھا۔ وہ بچپن سے پہاڑ چڑھنے اُترنے کا عادی تھا لہٰذا وہ بہت آسانی سے دوسری طرف جا پہنچا۔ اس نے عمارت کا جائزہ لیا۔ آس پاس کی عمارتوں میں لوگ ملبے کو اِدھر اُدھر سے ہٹا کر دب جانے والے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری اور ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔

ریاض کو پچھلی سمت کھلنے والی ایک کھڑکی دکھائی دی جو اپنی جڑوں سے اکھڑ کر باہر آ گری تھی۔ اس نے چوکھٹ کو پکڑ کر کھینچا اور اسے الگ ڈال کر دیوار کی طرف متوجہ ہوا۔ چھت کے اوپر کا بھیم ٹوٹ کر اردو کے آٹھ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ جس کے درمیان کی جگہ خالی تھی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ریاض نے اندازہ لگایا کہ یہی وہ کمرہ تھا جس میں مہہ جبیں اور اس کی ساس موجود تھے۔ وہ آنکھیں گاڑھ کر کمرے کی تاریکی میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مٹی دھول میں

اٹے ہوئے کمرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے زور سے آواز دی۔

''مہہ جبیں......مہہ جبیں......امی......امی''۔

اس نے کمر کے بل جھک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ نظر نہ آیا کیونکہ آنسوؤں سے تر آنکھوں میں گرد کے ذرے چلے گئے تھے۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھوں کی گرد صاف کی اور پھر دوبارہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں کمرے میں پھیلی ہوئی گرد بھی آہستہ آہستہ زمین بوس ہو رہی تھی۔ اب اسے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کمرے کی دس گیارہ فٹ بلند چھت اپنے ستونوں اور دیواروں کو توڑتی ہوئی زمین سے صرف چار فٹ پر آ کر اپنے بھیم کے سہارے رک گئی ہے۔ چھت کا سلیب کئی جگہ سے ٹوٹ گیا ہے اور سریا دکھائی دے رہا ہے۔ اور کمرے کی سامنے والی دیوار کے ساتھ بیڈ کے اوپر دو جسم ایک دوسرے کے اوپر ساکت پڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کے اوپر صرف فٹ بھر کے فاصلے پر پوری چھت اُدھڑی مگر تنی ہوئی ہے۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا اور یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگائی کہ جب زلزلہ آیا تو اس وقت امی نے اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش میں اپنا وجود ایک سائبان کی طرح اپنی حاملہ بیٹی کے اوپر تان دیا۔ لیکن یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اب اس حالت میں مہہ جبیں اور اس کا بچہ زندہ تھے کہ نہیں اور خود امی کی کیا کیفیت تھی؟

ریاض کو امید کی کرن نظر آئی۔ اس نے سوچا ہوسکتا ہے کہ ماہ جبیں کو بچانے میں امی کامیاب ہوگئی ہوں۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک آدمی ایک دکان سے کچھ مال واسباب سمیٹ رہا تھا۔ ریاض نے اسے آواز دی۔

''بھائی صاحب! پلیز میری مدد کریں''

وہ آدمی گھبرا گیا اور ہاتھ میں اٹھایا ہوا سامان لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ریاض نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی چور اچکا تھا اور ٹوٹی ہوئی دکان سے جس کے مالک کا کچھ پتا نہیں تھا سامان چوری کر رہا

تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا کہ کیا اس قیامت کی گھڑی میں کوئی اس قدر بے حس درندہ اور شیطان بھی ہوسکتا ہے۔ اس سے زیادہ سوچنے کی اسے فرصت نہیں تھی۔ اس نے ایک اور شخص کو مدد کے لیے پکارا۔ جو ایک تباہ شدہ گھر کے باہر کھڑا ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آیا۔ ریاض بولا۔

''بھائی یہاں اندر میری بیوی اور میری ساس ہیں۔ تھوڑی سی میری مدد کرو۔ میں اندر جاتا ہوں۔ آپ باہر سے تھام لینا''۔

''کیا وہ زندہ ہیں؟''

''خدا جانے۔ لیکن اللہ کرے زندہ ہوں۔ دراصل میری بیوی حاملہ ہے''

''اوہ''۔

اس شخص نے قدرے افسوس سے کہا۔

ریاض قدم بڑھا کر اندر کود گیا۔ اس کا سر بھیم سے ٹکرایا۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ مگر وہ اپنے درد سے لاپرواہ تھا۔ چار فٹ کی اونچائی میں وہ رکوع کی حالت میں ہو گیا تھا۔ اس کا سر اور کمر چھت سے ٹکرا رہے تھے۔ باہر کھڑے ہوئے شخص نے آواز دی۔

''چھت کو ہاتھ مت لگاؤ''

''جی جی''

اس نے آہستہ سے کہا۔ اور دُہری حالت میں آگے کی طرف کھسکنے لگا۔ اس کے پیروں سے کوئی چیز ٹکرائی۔ دیکھا تو چھت کا پنکھا تھا جو کہ اپنے کنڈے سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا ہوگا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مریضہ کا بیڈ کمرے کے وسط میں نہیں تھا وگرنہ اس وقت یہ پنکھا......

اسے سوچتے ہوئے جھرجھری آ گئی اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ اب وہ بستر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سے مہہ جبیں کو دیکھا۔ اسے ٹٹولا۔

اس کے جسم میں زندگی کی حرارت محسوس کرنے کی کوشش کی۔

اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گالوں کو تھپتھپایا۔

اور پھر آواز دی۔

''مہہ جبیں''۔

دوبارہ پکارا۔

''مہہ جبیں''۔

پھر پکارا۔

''مہہ جبیں''۔

تیسری آواز پر جسم میں حرکت ہوئی۔ جیسے کوئی لوٹ آیا ہو۔ ریاض کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اس نے باہر کھڑے ہوئے آدمی کو خوشخبری سنائی۔

''زندہ ہے......میری بیوی زندہ ہے''۔

''دوسری عورت کو دیکھو''۔

باہر کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ریاض کو یاد آیا کہ اس کی بیوی کے بدن پر کوئی سائبان تانے ہوئے بھی ہے۔ وہ جھکی جھکی حالت میں مہہ جبیں کے پیروں کی طرف گیا۔ ریاض کی ساس کا سر اسی طرف تھا۔ ریاض نے انہیں کندھے سے ہلایا۔ کوئی ہل جل محسوس نہ ہوئی۔ اس نے ان کی کلائی کو پکڑ کر دیکھا۔ نبض چل رہی تھی۔ ریاض نے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور باہر کھڑے ہوئے آدمی سے کہا۔

''یہ بھی زندہ ہیں۔ مگر بے ہوش ہیں''۔

''ایسا کرو بیڈ کو کھینچ کر یہاں تک لے آؤ''۔

باہر کھڑے ہوئے شخص نے اسے مشورہ دیا۔اسے مشورہ معقول لگا۔اس نے بیڈ کے پائپ کو پکڑ کر خمیدہ حالت میں کھینچنے کی کوشش کی۔الٹے قدموں اس کے پیر پھسلنے لگے۔ریاض نے اور زیادہ قوت لگائی۔بیڈ تھوڑا سا سرک گیا۔اس نے مزید قوت سے بیڈ کو پیچھے کی طرف کھینچا تو پیروں میں پڑا ہوا پنکھا الجھ گیا۔پائپ پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی اور وہ اچانک کولہوں کے بل چکنے فرش پر بکھرے ہوئے سیمنٹ کے پتھروں پر گر پڑا۔چھت سے گرے ہوئے پنکھے کی راڈ ریاض کی ران کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔اس نے ہتھیلی سے گوشت کو دبایا تو اس کا ہاتھ خون میں لت پت ہو گیا۔جسم پر بے شمار خراشیں وہ پہلے ہی جھیل چکا تھا۔کھڑکی سے کودتے ہوئے سر ٹکرایا تھا اب اس جگہ گومڑ سا بن گیا تھا۔

مگر ریاض اپنے سارے زخم اور اپنا سارا درد بھول چکا تھا۔اسے خوشی تھی کہ مہہ جبیں زندہ ہے۔اس کی امی کی سانس بھی چل رہی ہے اور اسے یہ بھی امید تھی کہ انشاء اللہ اس کا بچہ بھی سلامت ہوگا۔

وہ اٹھا اور پنکھے کو پیر سے ایک طرف سرکاتے ہوئے دوبارہ بیڈ کے پائپ کو پکڑ کر کھینچنے لگا۔اس کے پیر میں سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر وہ پوری قوت سے بیڈ کو اردو کے آٹھ کے ہندسے کی صورت میں کھلی ہوئی جگہ پر لے جا رہا تھا۔آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

باہر کھڑے ہوئے شخص کی مدد سے پہلے اس نے اپنی ساس کو نکالا جو کہ اب تک بے ہوش تھیں۔پھر وہ مہہ جبیں کی طرف متوجہ ہوا جو تقریباً ہوش میں آ چکی تھی۔اور تشکر آمیز نظروں سے ریاض کی طرف دیکھ رہی تھی۔ریاض نے اسے دیکھا۔وہ نقاہت بھری آواز سے بولی۔

''میں اٹھنے کی کوشش کرتی ہوں۔تم یہ ڈرپ ہٹادو''۔

ریاض نے بازو میں منسلک ڈرپ کو دیکھا جس کی بوتل اب زمین پر پڑی ہوئی تھی۔اور بیڈ کے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی آئی تھی۔اس نے نس میں پیوست سوئی کو علاحدہ کیا۔

مہہ جبیں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کمر میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دوبارہ لیٹ گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جب اس کی سانس بحال ہوئی تو اسے اندازہ ہوا کہ جس کمرے میں وہ لیٹی ہوئی تھی اب ایک غار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی آنکھ اور چھت کے درمیان جو فاصلہ تھا اب سمٹ کر بہت کم رہ گیا ہے۔ اگر یہ فاصلہ اس سے کچھ اور کم ہوتا تو شاید وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے لیکن اس ابتری کی حالت میں اپنے شوہر ریاض کو قریب پا کر تشکر اور محبت کی ملی جلی کیفیت کے حصار میں تھی۔ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور خود سے سوال کیا ''یہ کیسا ہے'' اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔

اسے یاد آیا کہ جس وقت زمین لرزی اور اچانک کمرا جھولے کی طرح ڈولنے لگا تو اس کی ماں ایک دم اس کے اوپر آ کر الٹی لیٹ گئی تھی۔ اور زلزلے کی حالت میں کئی بار اس کے اوپر اُچھلی بھی تھی۔ اور پھر اچانک دیواریں زمین بوس ہوتی چلی گئیں اور چھت اس کے سر پر آن گری۔ پھر اسے کوئی ہوش نہیں رہا۔

اب ریاض اپنی پوری کوششوں سے کمرے میں کسی نہ کسی طرح داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کی امی کو باہر نکال لیا گیا ہے اور اب اسے نکلنا ہے۔ اس نے خود سے کہا ''مجھے ہمت کرنا چاہیے'' اس نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔ ریاض نے خمیدہ حالت میں اس سے کہا۔

''میں تمہیں بٹھاتا ہوں''۔

اس نے آگے بڑھ کر مہہ جبیں کی کمر میں محبت سے ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھنے میں مدد دی۔ مہہ جبیں کروٹ سے اٹھنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر وہ جھک کر بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ باہر کھڑے شخص نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''بہن اللہ تمہیں اور تمہارے بچے کو زندگی دے تم بہت ہمت والی ہو''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے راستہ دیا۔ ریاض پہلے خود تنگ جگہ سے باہر نکل گیا اور پھر مہہ جبیں کو اپنے بازوؤں میں بھر کر باہر نکالنے لگا۔ اس دوران کچھ لوگ دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دوسروں کی مدد کر رہے تھے۔ کچھ اپنی مدد کرنے میں مصروف تھے اور کچھ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ زندگی کے اس نازک موڑ پر قسم قسم کے باضمیر اور طرح طرح کے بے ضمیر انسان اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ یا شاید مگن نہیں تھے۔

ریاض نے باہر کھڑے ہوئے شخص کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

''میں نے کیا کیا ہے۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے''۔

پھر وہ مہہ جبیں سے مخاطب ہوا جو کہ نقاہت سے ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

''بہن تمہارا آدمی بہت اچھا ہے''۔

''آپ کی بھی مہربانی بھائی۔ آپ نے بہت مدد کی ہے''۔

مہہ جبیں نے تشکر اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ ریاض نے اس سے پوچھا۔

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

اس شخص نے تباہ شدہ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہاں رہتا تھا''۔

''آپ کو بھی تو مدد کی ضرورت ہوگی۔ چلیں میں وہاں چلتا ہوں''۔

''مجھے اب کسی مدد کی ضرورت نہیں''۔

پھر اس نے گردن جھکاتے ہوئے انتہائی درد بھری آواز میں کہا۔

''سب کا مقدر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ تمہاری بیوی کو اس چوڑے بھیم نے بچا لیا اور ایسے ہی چوڑے بیم نے میری بیوی کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ وہ مر گئی''۔

یہ کہتے ہوئے وہ شخص بلک بلک کر رونے لگا۔ مہہ جبیں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ریاض نے آگے بڑھ کر اس شخص کو سینے سے لگا لیا۔ وہ خود بھی رونے لگا۔ اور روتے ہوئے بولا۔

''دوست تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''پہلے بتا دیتا تو تم مجھ کو مدد کے لیے نہیں بلاتے''۔

ریاض نے اسے زور سے بھینچ لیا اور کہا۔

''مجھے معاف کر دینا بھائی''۔

دلاسا دینے کے لیے اس سے زیادہ الفاظ کہاں تھے۔ دونوں علاحدہ ہو گئے۔ اس شخص نے بے ہوش پڑی ہوئی ساس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے لے کر جاؤ گے اور کہاں جاؤ گے؟'' موبائل ہے تو کسی کو موبائل کرو''۔

ریاض کو یاد آیا۔ اس نے جیب کو ٹٹولا موبائل موجود تھا۔ اس نے عاشق علی کا نمبر ملایا۔ مگر نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے مایوسی سے فون جیب میں ڈال لیا۔ اسی اثنا میں اس نے عاشق علی کو دور سے آتے ہوئے دیکھا۔ جیسے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ریاض نے ہاتھ ہلا ہلا کر زور زور سے اشارہ کیا۔ عاشق علی نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قریب آنے لگا۔ ریاض نے کہا۔

''میری بیوی کے والد ہیں''۔

''چلو یہ اچھا ہوا''۔

یہ کہتے ہوئے وہ شخص اپنے شکستہ اور غم میں ڈوبے ہوئے گھر کی اداسیوں کی طرف لوٹ گیا۔ جاتے ہوئے نہ ہاتھ ملایا اور نہ خدا حافظ کہا۔ ریاض اس شخص کی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ اور شرمندہ تھا کہ اس سے دو لفظ ہمدردی کے بھی نہ کہہ سکا۔ اتنی دیر میں عاشق علی قریب آ گیا اور بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر گھبراہٹ سے پوچھنے لگا۔

''خیر تو ہے نا''۔

اور لپک کر بیوی کے قریب گیا اور اسے ہلا جلا کر دیکھا۔ ریاض نے کہا۔

''بے ہوش ہیں''۔

''چلو پھر ان کو لے کر چلو''۔

''کیسے لے کر چلیں؟''۔

''آں؟''

عاشق علی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ریاض نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''میں......وہ......اس............''

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ لحہ بھر کو مہہ جبیں کو دیکھا اور پھر ریاض کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ عاشق علی نے جو کچھ کہا اسے سن کر ریاض کے چہرے پر حیرت اور درد چھا گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ ایک لفظ نہ بول سکا۔ اس کا دایاں ہاتھ سینے پر آ کر ٹک گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں نے سارے بند توڑ دیئے وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔ وہ بے چین روح کی طرح ادھر سے اُدھر ہونے لگا۔ کبھی اس کا ہاتھ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچنے لگتا کبھی مٹھی کی صورت میں اپنی انگلیوں کو جکڑ لیتا۔ وہ اضطراری حالت سے گزر رہا تھا۔ عاشق علی نے جو کچھ کہا تھا اسے سن کر ریاض کی حالت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے گرتا ہوا دیکھ کر مہہ جبیں چونکی۔ اس نے بے چین ہو کر اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن عاشق علی نے آگے بڑھ کر اسے کہا۔

''تم بیٹھی رہو''۔

''ابو! انہیں کیا ہو گیا؟''

''کچھ نہیں۔ شہر کی حالت میں نے بتائی ہے تو ذرا صدمے سے ایسا ہو رہا ہے''۔

مہہ جبیں خاموش ہوگئی۔ عاشق علی نے ریاض کو دیکھا جو زمین میں دھنسا جار ہا تھا۔

نیچے......

نیچے......

اور نیچے............

(۱۳)

ابھی کلاسوں میں پہلا پیریڈ شروع ہوا تھا۔ حاضری لینے کے بعد تمام اساتذہ اپنے ٹائم ٹیبل شیڈول کے مطابق تدریس میں مشغول ہو چکے تھے۔

تدریس حساب کی۔

کہ اس کے بغیر دنیا میں وقت سے لے کر معیشت کے لین دین کا کوئی اصول مرتب نہیں کیا جا سکتا۔

تدریس اسلامیات کی۔

کہ اس کے بغیر دین اخلاقیات، خالق اور بندے کے تعلق اور زندگی کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری ممکن نہیں۔

تدریس سائنس کی۔

کہ اس کے بغیر انسان ترقی کا ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔

تدریس زبانوں کی۔

کہ اس کے بغیر انسان ایک دوسرے کے قریب نہیں آ پاتا۔

تمام اساتذہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق قوم کے نونہالوں کو علم سے بہرہ مند کر رہے تھے۔ اور قوم کے نونہال بچے اپنی پوری توجہ اور لگن کے ساتھ کہیں کچھ لکھ رہے تھے، کہیں تختہ سیاہ سے کچھ لکھا ہوا اتار رہے تھے، کہیں کتاب سے کچھ پڑھ رہے تھے، کہیں ٹیچر سے کچھ سمجھ رہے تھے اور کہیں کچھ سنا رہے تھے۔ دوسری طرف رباب آفس کے کاموں میں مصروف تھی کہ دو بچوں نے کمرہ میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ دونوں کے ہاتھوں میں ڈھیر ساری کاپیاں تھیں۔

''میڈم! یہ کاپیاں مس نے بھجوائی ہیں''۔

''رکھ جاؤ، سر آئیں گے تو سائن کروا دوں گی''۔

بچے کاپیاں میز پر رکھ کر پلٹے۔ عین اسی وقت ملازمہ حاضری رجسٹر لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اچانک یوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ سے رجسٹر لے کر اچھال دیئے ہوں۔ لمحے بھر کو رباب سمجھی بچوں نے شرارت کی ہے۔ اس نے ڈانٹنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کمرے میں بھونچال آ گیا۔ کرسی میز ہلنے لگیں دونوں بچے گر پڑے۔ ماسی نے دیوار کو تھاما لیکن دیواریں بھی لرز رہی تھیں۔ یکا یک تمام کلاسوں سے بچوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ پورے اسکول میں کہرام برپا ہو گیا۔ پھر ایسا لگا جیسے بہت سارے پتھر گر رہے ہوں۔ چیزیں ٹوٹ رہی ہوں۔ رباب کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا۔ اسی اثنا میں کوئی بھاری چیز اس سے ٹکرائی۔ وہ خود کو سنبھال نہ سکی اور گر پڑی۔ پھر اندھیرے میں گم ہوتی چلی گئی۔

لمحوں میں اسکول کی عمارت یوں لرزنے لگی جیسے بچوں کے کھیل بلاک اسٹرکچر میں اوپر تلے

رکھے ہوئے پلاسٹک کے بلاکس ہلنے لگیں اور پھر وہ گرنا شروع کر دیں۔

چاروں طرف دردناک چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ کسی کو اسکول کی عمارت سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری عمارت ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ ہر طرف گرد و غبار پھیل گیا۔ بچوں کے چیخنے کی آوازیں ہزاروں ٹن وزنی ملبے تلے دب کر رہ گئی تھیں۔

اسکول کے آس پاس کی عمارتوں میں بھی یہی صورتحال تھی۔ کہیں کم کہیں زیادہ۔ ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ لوگ چیختے پکارتے ادھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی بو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

ملبے کے ڈھیر میں سینکڑوں بچے دبے ہوئے تھے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ معصوم اور روشن چراغ آنکھوں والے بچے زندہ ہیں، زخمی ہیں یا......

بچے کیا دبے مستقبل دب گیا تھا، جیسے آنے والا کل چھن جائے۔ جیسے کوئی خواب دیکھنا چھوڑ دے، جیسے کوئی امید ہاتھ سے پھسل جائے، جیسے کوئی آرزو دفن ہو جائے جیسے جیسے......

جن کی امیدیں جن کی آرزوئیں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہی تھیں وہ دوڑے چلے آ رہے تھے۔ چھاتی کوٹتے...... تڑپتے...... سسکتے...... لرزہ بر اندام...... دھڑکتے دل اور بے قرار آنکھوں کے ساتھ۔ جس جس کے کلیجے کا ٹکڑا آج صبح ہنستا مسکراتا، گنگناتا ہوا اپنے کندھوں پر علم و حکمت سے بھری کتابوں کا لطافت بھرا بوجھ اٹھائے ناتواں قدموں آنگن کی دہلیز پار کر کے یہاں آیا تھا وہ ان پیاروں کی خبر گیری کے لیے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ مگر جوں ہی وہ یہاں پہنچتے جاتے پھٹی آنکھوں سے ہر شے کو بکھرا ہوا پاتے اور دھم سے کلیجہ تھام کر رہ جاتے۔

آنے والوں میں اقبال بھی تھا۔ اس کے تینوں بچے کلثوم، فاطمہ اور جاوید اسی ملبے کے ڈھیر میں ڈھیر ہو گئے تھے۔ کلثوم اور فاطمہ کی کلاس ایک ہی تھی لیکن جاوید کی کلاس علاحدہ تھی۔ پہلے تو کسی کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کیا جائے؟ مگر پھر کسی منصوبہ بندی کے بغیر ملبہ ہٹانے کی

کوشش کرنے لگے۔ آر سی سی کی بنی ہوئی دو منزلہ عمارت کا ملبہ کچے پکے مکانوں کی طرح نہیں تھا کہ اسے آسانی سے ہٹالیا جائے۔ گو کہ ٹھیکیدار عاشق علی نے عمارت کی تعمیر کے وقت اس کی مضبوطی سے سمجھوتا کیا تھا، تاہم لوہے اور کنکریٹ کی دو چھتیں اوپر تلے زمین بوس ہوگئی تھیں اور اب دور سے دیکھنے میں دونوں چھتیں تقریباً باہم و یکجا ہوگئی تھیں۔ دونوں چھتوں کے درمیان کا فاصلہ دو فٹ چوڑے بھیم کے علاوہ صرف دو فٹ اور رہ گیا تھا اور وہ دو فٹ کا درمیانی حصہ بھی دیواروں کے ملبے سے اٹا پڑا تھا۔ کنکریٹ کی چھت کے سلیب میں جگہ جگہ دراڑیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی لوگوں نے وہاں سے اندر جھانکنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جب تک اس لوہے کو کاٹا نہ جاتا، اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود لوگ دیواروں کے ملبے کو مسلسل ہٹانے اور جگہ بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

وقت گزرتا جارہا تھا۔ سورج چڑھتا ہوا سروں پر آ گیا۔ ہر شخص روزے سے تھا اور روزے کے فلسفے کی روشنی میں صبر و استقامت اور ہمت کا سائبان اوڑھے ہوئے تھا۔ لیکن اولاد کی محبت ان سب کو بے چین اور بے قرار کیے دے رہی تھی۔ ایسے میں جب کہیں سے کوئی آواز، کوئی مدد کی طلب، درد میں ڈوبی ہوئی سسکی یا چیخ سنائی دیتی تو لوگ اسی طرف متوجہ ہوجاتے اور کوشش کرتے کہ انہیں حوصلہ دیں اور وہاں سے جلدی نکالنے کا یقین دلائیں۔

کئی گھنٹے کی مشقت کا آخر نتیجہ برآمد ہونا شروع ہوگیا۔ لیکن صبر کی ڈوری ٹوٹ گئی اور امید و آس کا دیا ٹمٹمانے لگا۔ معصوم بچوں اور بچیوں کے ادھڑے ہوئے لہولہان اور دریدہ بدن سامنے آنے لگے اور پھر ہر آنکھ نم ہوتی چلی گئی۔ نکلنے والا بچہ کس کا تھا، اس کا نام کیا تھا، اس کے ماں باپ کون تھے۔ یہ دیکھنے سے پہلے ہی ہر دردمند دل تڑپ اٹھا، مچل گیا اور بے قرار ہو کر آنسوؤں کا خراج پیش کرنے لگا۔

لاشیں بیچ میدان میں بہت احترام سے رکھی جانے لگیں اور لوگ اپنے جگر گوشوں کو پہچان کر

نامراد سینے سے لپٹانے لگے۔ کچھ یہاں سے مایوس ہوکر اپنے پیارے لال و گوہر ڈھونڈنے کے لیے ملبے کی سمت راہ لیتے۔

اس ہاہا کار میں ریاض بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ راستے ہی میں قیامت خیز تباہی دیکھ کر کرچی کرچی ہو چکا تھا۔ اور جب اس نے اپنے جذبے اور جنون سے لگائے ہوئے پودے کی ایک اک شاخ ایک اک پتے ایک اک ٹہنی اور ایک اک پھول کو بکھرے ہوئے دیکھا تو وہ لرز کر رہ گیا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ان للہ وان الیہ راجعون"

اور پھر آنسوؤں کی جھڑی اسے اندر ہی اندر بھگوتی چلی گئی۔

ریاض ایک مشن کی طرح بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ درس و تدریس اس کے لیے آمدن کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک خواب تھا، خواہش تھی، ایک تڑپ تھی۔ اسے اپنے ہر طالب علم کی شکل یاد تھی۔ وہ اپنے اسکول میں پڑھنے والے ہر بچے کو کہیں بھی دیکھ کر پہچان لیا کرتا تھا۔ ان ساعتوں میں یہی پہچان اس کے دل و دماغ پر حاوی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چھوٹے بڑے سب بچوں کی خوبصورت، معصوم، فرشتہ صورتیں گھوم رہی تھیں۔

وہ تڑپ کر اب تک نکالی گئی لاشوں کے قریب آ گیا۔ علم و آگہی کے ان بجھے ہوئے چراغوں کو دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ کبھی ان بچوں کی طرف دیکھتا اور کبھی ملبے کا ڈھیر بنے ہوئے اسکول کو دیکھنے لگتا۔

اشک بار آنکھوں والوں میں وہ بھی شامل تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس کا درد ان ماں باپ سے سوا تھا جو وہاں اپنے ایک دو یا تین جگر گوشوں کو ڈھونڈنے آئے تھے۔ ریاض اس وقت سینکڑوں بچوں کا لٹا پٹا استاد اور برباد روحانی باپ تھا، جسے زلزلے کی دو دھاری تلوار نے کاٹ کر ہزاروں ٹکڑوں میں بانٹ دیا تھا۔ مگر درد سہنے کے لیے وہ پھر بھی زندہ تھا۔

اس دوران اقبال کی پوری کوششوں کے باوجود کلثوم، فاطمہ اور جاوید تک کوئی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ وہ اب بھی لوگوں کے ساتھ ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اور پوری تندہی سے ملبہ ہٹانے کی جاں توڑ کوششوں میں مصروف تھا۔ کچھ عورتیں بھی اس سعی لاحاصل میں شریک تھیں۔

کئی لوگ قسمت کے اس لکھے کو پڑھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اس تباہی میں معصوم بچوں کا بچ جانا محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی ناامید نہیں تھا۔ اب بھی ان کی امید کا دیا روشن تھا۔ وہ اپنے رب کی ذات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے کہ وہ جب اور جہاں چاہے معجزے دکھا سکتا ہے۔ اسی آس اور ڈھارس سے بندھے ہوئے وہ چھوٹے موٹے گھریلو اوزاروں، چھینی، ہتھوڑی، بیلچے، یا پھاوڑے کی مدد سے کنکریٹ کے پہاڑ سے نبرد آزما تھے۔ ٹھیکیدار عاشق علی کی ناقص میٹریل سے بنائی ہوئی بے شمار کمزوریوں والی یہ عمارت زلزلے کے خطرناک جھٹکے برداشت نہیں کر سکی اور آناً فاناً ڈھے گئی۔ لیکن ان کپکپاتے بازوؤں والے ماں باپ کے سامنے وہ اب بھی لوہے اور کنکریٹ کا ایسا پہاڑ تھا جسے اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے بھاری مشینری درکار تھی، جو کہ یہاں دستیاب نہیں تھی۔

اقبال جو بہت دیر سے سعی لاحاصل میں مصروف تھا کو یاد آیا کہ اس کے گھر کی بھی اس وقت یہی حالت ہے اور وہاں اس کی بیوی یکا و تنہا ہے۔ تب اس نے گھر لوٹنے کا سوچا۔ مگر پھر اس نے خیال کو جھٹک دیا۔ ''نہیں۔ یہاں میرے بچے ہیں''۔

اس نے سوچا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنے بھائی کے بچوں کا خیال آیا۔ اور پھر اس وقت گھر میں دو بچے اور بھی تھے، جو کسی بھی طرح اس کے بھائی کے بچوں سے کم پیارے نہیں تھے۔

مگر میں یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں؟

اس نے اپنے خیال کی تردید کی۔ وہ کشمکش میں مبتلا تھا۔ چھت کا بھاری سلیب اس کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ تب پاس ہی ملبہ ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے والی ایک عورت کے

ہاتھ اس کی اپنی بیوی کے ہاتھ لگے کہ شاید وہ بھی ملبہ ہٹانے میں ناکام ہو رہی ہوگی۔

وہ ملبے سے نیچے اتر آیا۔ اچانک اسے لگا جیسے فاطمہ نے آواز دی ہو......کلثوم نے پکارا ہو ......اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تینوں بچوں کی صورتیں گھوم گئیں۔ وہ ایک بار پھر بے قرار ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں اور وہ سر پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا۔

کیا کرے......کیا نہ کرے......کہاں جائے......کہاں نہ جائے......اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس اثنا میں ایک ہاتھ اس کے کاندھے پر آ کر ٹھہر گیا۔

''اقبال بھائی! صبر کرو اللہ سب ٹھیک کر دے گا''۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ یہ ریاض تھا۔ اسکول کا پرنسپل۔ اقبال کچھ نہ بولا۔ بس ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ ریاض نے پوچھا۔

''آپ کے گھر کی کیا حالت ہے؟''

''کچھ پتا نہیں''۔

''ارے تو آپ گھر جاؤ''

''مگر میرے بچے؟''

''ہو سکتا ہے اس وقت آپ کی ضرورت گھر پر زیادہ ہو۔ یہاں میں ہوں اور دوسرے بہت سارے لوگ ہیں''۔

''تو پھر میں گھر جا کر دیکھوں؟''

''ہاں ہاں۔ آپ وہاں جاؤ اور دیکھو۔ اور اگر وہاں سب خیریت ہو تو پھر واپس یہاں آ جاؤ۔ اللہ کرے وہاں سب خیریت ہو''۔

یہ سن کر اقبال گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس دوران کچھ لوگ ریاض کے قریب آ گئے اور بیک وقت بولنے لگے۔

''سر کچھ کریں۔ کسی بڑی مشین کا بندوبست کریں''۔

''سر کوئی کرین منگوالیں''۔

''سر لوہا کاٹنے والا بلیڈ''

''بلیڈ سے نہیں کٹے گا، گیس پلانٹ چاہیے''۔

''وہ تو گیٹ جالی والوں کے پاس بھی ہوتا ہے''۔

''اس وقت کون گیٹ جالی والا ہوگا''۔

ریاض افسردگی سے سب کی باتیں سنتا رہا۔ وہ زلزلے کی شدت اور اس کے اثرات سے واقف تھا۔ اس نے مظفر آباد شہر کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ یہ زلزلہ دور دور تک قیامت بپا کر گیا ہوگا۔ کسی کو کچھ اندازہ نہیں ہے کہ پہاڑوں پر کیا صورت حال ہے۔ جہاں نہ راستے ہیں، نہ رسدگاہیں اور نہ ہی رابطے کا کوئی اور ذریعہ۔ ہسپتال تباہ ہو چکے ہیں۔ انتظامیہ کے لوگ خود اس تباہی سے دوچار ہیں، لہذا ان سے مدد کی توقع رکھنا بے کار اور عبث ہے۔ ہر شخص کو اپنی مدد آپ کرنا ہے، اپنا لاشہ خود اٹھانا ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو ایک سے زیادہ لاشے بھی اٹھانے پڑیں، ایک سے زیادہ قبریں کھودنا پڑیں۔

انفرادی قبریں......

اجتماعی قبریں......

لاشیں ہی لاشیں......

ریاض کو جھرجھری آ گئی......

ایک شخص نے کہا۔

''میرا چاچا بتا رہا ہے کہ مظفر آباد کے سارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ پہاڑوں سے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں۔ پوری پوری سڑکیں غائب ہو گئی ہیں''۔

''لینڈ سلائیڈنگ''

دوسرے نے وضاحت کی۔

''ہاں! لینڈ سلائیڈنگ ہو رہی ہے''۔

''یہ سب خطرناک ہے۔ لوگوں کو اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔ اگر راستے بند ہو گئے تو ہم سب محصور ہو جائیں گے اور بیرونی امداد نہ ملنے کی صورت میں سخت مشکل سے دوچار ہو جائیں گے''۔

ریاض نے اپنی رائے دی تو ایک شخص بولا۔

''ریاض بابو! آپ کچھ کریں آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں''۔

''اس وقت میں آپ لوگوں سے صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ہمت سے کام لیں''۔

جب ریاض یہ کہہ رہا تھا تو کچھ اور لوگ اس کے قریب آ گئے۔ وہ مزید گویا ہوا۔

''آپ سب لوگ کچھ باتوں کو بہت اچھی طرح ذہن میں رکھیں۔ ہمیں زلزلے کی شدت کا پوری طرح سے علم نہیں ہے کہ اس سے کتنے بڑے علاقے پر تباہی آئی ہے۔ خدا کرے جتنا ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اتنا ہی ہو۔ لیکن اس سے زیادہ ہے تو پھر اللہ رحم کرے۔ کیونکہ اس وقت ہمارے نزدیک کا کوئی ہسپتال سلامت نہیں ہے''۔

ابھی ریاض یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ملبہ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے چند آدمیوں نے آواز دی۔ ریاض اس طرف دوڑ پڑا۔ ایک نوجوان بولا۔

''ریاض بھائی! یہاں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں''۔

سب متوجہ ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے مل کر بڑے بڑے پتھروں کو ہٹانے کی کوشش کی۔ مایوسی کے اندھیرے میں اچانک امید کی کرن پھوٹی تھی۔ سب احتیاط سے پتھروں کو ہٹانے لگے۔ ملبے کے اندر گھسنے کے لیے جگہ بن گئی تو وہی نوجوان پیٹ کے بل لیٹ کر اندر کی طرف رینگنے لگا۔

آدھے سے زیادہ دھڑ ملبے کے اندر غائب ہوگیا۔ پھر وہ اندر سے آہستہ آہستہ پتھر سرکانے لگا۔ کچھ اور جگہ بنی تو وہ اور اندر سرک گیا۔

باہر کھڑے ہوئے لوگ کسی آہٹ، کسی آواز کا انتظار کرنے لگے۔ ایک اذیت تھی جس سے سب دوچار تھے۔ صبر تھا جو ہاتھ سے پھسلا جارہا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک امید تھی جسے سب نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے وہی نوجوان پکارا۔

''ریاض بھائی! کسی ایک آدمی کو اندر بھیجیں''۔

ریاض فوراً خود آگے بڑھا اور پیٹ کے بل سرکتے ہوئے اندر اترنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کشادہ جگہ پر تھا۔ یہ کوئی کلاس تھی۔ پینتیس چالیس بچوں پر مشتمل کلاس۔ جسے دیکھتے ہی ریاض نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے سر کو دونوں بازوؤں میں چھپا کر آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا کہ مبادا بچے نہ دیکھ لیں کہ ہیڈ سر تو رو رہے ہیں۔

مگر بچے دیکھ کہاں رہے تھے۔ وہ تو لکڑی کی ڈیسکوں کی طرح خود بھی ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے پڑے تھے۔ عجیب دہشت ناک اور غمزدہ کر دینے والا منظر تھا۔ ہر بچہ زخموں سے چور تھا۔ کسی کے ہاتھ سلامت تھے سر نہیں، کسی کا سر سلامت تھا ہاتھ اور جسم نہیں۔ کوئی ڈیسکوں میں پھنسا ہوا تھا تو کوئی دیوار میں۔ کچھ بچوں کی معصوم روحیں نہ جانے کس لمحے اور کس حالت میں قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھیں۔ کچھ سسک رہے تھے اور کچھ بے ہوش تھے۔

ریاض ان معصوموں کو جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ اس کا ہم نام ریاض احمد ابھی دو دن پہلے روزہ نہ رکھنے پر اس سے ڈانٹ کھا چکا تھا۔ اس وقت کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اب پورے روزے رکھے گا۔ اسے یقین تھا کہ یہ معصوم آج روزے سے ضرور ہوگا۔ وہ شریف، فیصل اور احمد کو بھی جانتا تھا۔ یہ کلاس کے ہونہار طالب علم تھے۔ اول دوئم سوئم آنے

والے، ہمیشہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے۔شاید یہاں سے رخصت ہونے میں بھی انہوں نے مقابلہ کیا ہوگا۔

یہ سوچتے ہوئے ریاض کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو بھر آئے۔وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ ریاض کو اچانک کچھ خیال آیا۔وہ چاروں طرف آنکھیں دوڑانے لگا۔اور پھر متلاشی نگاہوں نے اسے پالیا۔وہ سہ رویہ ڈیسکوں کے بیچ میں ایک جگہ پھنسی ہوئی اوندھی پڑی تھی۔ریاض نے اسے پہچان لیا۔یہ نیلم تھی۔انگلش کی بہترین ٹیچر۔انتہائی قابل اور مخلص اور اپنے کام سے محبت کرنے والی۔عید کے فوراً بعد نیلم کی شادی تھی۔عابد کے ساتھ،جس کی بازار میں سینٹری کے سامان کی دکان تھی۔اور جو ریاض کا دوست تھا۔

ریاض کی نم آلود آنکھوں میں مناظر دوڑنے بھاگنے لگے۔چند ماہ پہلے یہیں اسکول میں عابد نے جب اس کو بتایا تھا کہ مجھے تمہاری یہ ٹیچر بہت اچھی لگتی ہے۔اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔تب اس نے عابد کو کہا تھا کہ یہ میرے اسکول کی بہترین ٹیچر ہے اور تم اسے یہاں سے لے جانا چاہتے ہو؟

''یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہاری ٹیچر اسکول سے کہیں نہیں جائے گی۔البتہ میرا گھر بس جائے گا۔ہوسکا تو میں دو چار برس میں تمہارے اسکول کے لیے کچھ طالب علم بھی بھجوادوں گا''۔

عابد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔کچھ ہی دنوں میں ریاض کی کوششوں سے یہ رشتہ طے ہوگیا اور اب عید کے بعد شادی ہونے والی تھی۔مگر اس وقت تو سب کچھ چکنا چور ہوگیا تھا۔ریاض کی حالت دیکھ کر نوجوان اس کے قریب سرک آیا اور بولا۔

''ریاض بھائی! ہمت سے کام لیں۔ہمیں ان سب کو باہر نکالنا ہے''۔

ریاض نے اثبات میں گردن ہلائی اور گہری سانس لیتے ہوئے ہمت کا اظہار کیا۔اور پھر تندہی سے دونوں ان معصوم بچوں کو نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔سب سے پہلے وہ ان زخمی بچوں

کی طرف متوجہ ہوئے جنہیں فوری طبی امداد سے بچایا جا سکتا تھا۔ اپنے اصل حجم سے نصف سے بھی کم جگہ میں سکڑا ہوا کھنڈر نما کمرا جس کی دیواریں زمین بوس ہو چکی تھیں اور چھت ایک طرف لٹک کر جھول گئی تھی، سے بچوں کو نکالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ لیکن ریاض اور نوجوان نے پوری احتیاط اور تندہی سے اس کام کو سرانجام دیا۔ باہر کھڑے ہوئے مضبوط ہاتھوں نے جب بچوں کو زخمی مگر زندہ حالت میں پایا تو اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور پھر دیوانہ وار خوشی سے سرشار ہو کر چلائے۔

اللہ اکبر......اللہ اکبر......اللہ اکبر

فضا اللہ کی بڑائی اور بزرگی کے نعرے سے گونج اٹھی۔ ایمان جو انسانوں کا آخری سہارا ہے، یکا یک بیدار ہو گیا۔ مگر ابھی زندگی کے کڑے عذاب سے گزرنے کے بہت سے مرحلے باقی تھے۔

(۱۴)

یااللہ مدد

یااللہ مدد کر۔

بے چین بے قرار بلکتی سسکتی زینب بڑبڑاتی جارہی تھی اور اپنے نسوانی ہاتھوں سے ملبے کو ہٹانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ابھی پتھروں کے نیچے سے کسی نے مدد کے لیے پکارا تھا اور وہ اللہ سے مدد مانگ رہی تھی۔زینب پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ہر مشکل گھڑی میں صرف اللہ کو پکارنا چاہیے۔تو پھر ملبے کے نیچے سے کوئی اسے کیوں مدد کے لیے پکارر ہا ہے۔زینب معصوم یہ کیسے سوچ سکتی تھی۔وہ تو ایک سادہ سی کشمیری عورت تھی۔وہ زندگی کے رمز کو اتنی گہرائی سے کہاں دیکھ سکتی تھی۔اسے کیا معلوم تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے۔کیونکہ مدد کرنا تو خدا کی صفات میں سے ایک ہے۔اور جو انسان خدا کی صفات میں سے کوئی

صفت اختیار کرتا ہے تو وہ خدا نہیں بن جاتا بلکہ خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔ اس کا مقرّب بندہ بن جاتا ہے۔

زینب بھی خدا کی مقرّب بندی بنی ہوئی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت اسی رب ذوالجلال نے زینب کے ناتواں ہاتھوں میں بے پناہ قوت اور ہمت دے دی تھی کہ وہ بھاری سلیب اور لکڑی کی موٹی بلیوں کو ہٹانے میں کامیاب ہونے لگی۔ تب اسے ایک ہاتھ اور بدن کا کچھ حصہ نظر آیا۔ وہ محتاط ہوگئی۔ کاندھے کے پاس اس کے اپنے استعمال والا لوہے کا صندوق دکھائی دیا۔ زینب نے گھٹنے کے بل جھک کر صندوق کے آس پاس کی مٹی ہتھیلیوں سے کھینچنا شروع کی۔ آہستہ آہستہ جگہ بنتی چلی گئی۔ اس اثنا میں اندر سے آواز آئی۔

''بکس...... بک...... بکس مت کھینچنا۔ میں اس کی وجہ سے محفوظ ہوں''۔

یہ محبّت کی آواز تھی۔

''اللہ کا شکر ہے صاحب''۔

''دیکھو میرے گھٹنے کے اوپر جو لکڑی ہے اسے کوشش کر کے اوپر اٹھاؤ''۔

''ہاں ہاں صاحب...... ابھی...... ابھی لو...... میں...... میں کرتی ہوں''۔

زینب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور موٹی لکڑی کے سلیب کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگی مگر لکڑی کے اوپر وزن بہت زیادہ تھا۔ زینب کے ہاتھ اسے اٹھانے سے قاصر تھے۔ اس نے دوبارہ کوشش کی اور پوری قوت لگا دی۔ مگر اس کی سانس پھول گئی۔ وہ گہری گہری سانس لینے لگی۔ اور ایک بار پھر قوت مجتمع کر کے لکڑی کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''صاحب آپ بھی کوشش کرو''۔

محبّت نے اپنے جسم کو جنبش دی اور اس طرح وہ تھوڑا سا جسم سرکانے میں کامیاب ہو گیا۔

محبّ نے اپنے سر کو ادھر اُدھر ہلا کر لوہے کے بکس کی آڑ سے نکالا۔ دھول مٹی میں اٹا ہوا محبّ اپنی آنکھوں سے آسمان کو دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے اس کی نظر زینب پر پڑی۔ محبّ کی آنکھوں میں اس کے لیے تشکر کے جذبات اُبھر آئے۔ اب وہ اپنے بدن کو سرکا سکتا تھا مگر اسے یہاں تک نکالنے میں ساری کوشش اسی عورت نے کی تھی۔ اسے زندگی دینے والی یہی زینب تھی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب ایک ڈاکٹر کسی مریض کی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو مریض اور اس کے لواحقین کی آنکھوں میں ممنونیت کیسے جذبات ہوتے ہیں۔

اس وقت وہی جذبات خود ایک ڈاکٹر کی آنکھوں میں تھے۔ جس کی مسیحا ایک دیہاتی عورت تھی۔ جس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کیونکہ اسے اتنا معلوم تھا کہ وہ قیامت خیز زلزلے کی تباہ کاریوں میں ایک انسان کی جان بچانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔

محبّ ٹوٹی ہوئی قوت مجتمع کر کے تھوڑا اور باہر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے جن کی مدد سے وہ اپنے پیروں کو بھی آزاد کر سکتا تھا۔ وہ اپنے پیر آزاد کرنے لگا پھر وہ اس میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس کے جسم پر بے شمار خراشیں تھیں جن میں سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔

محبّ کو اپنے زخموں کی پروا نہیں تھی۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔ پھر حیرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہو گیا؟''

''صاحب بہت تباہی ہوگئی ہے''۔

''اللہ رحم کرے''۔

''ہاں صاحب اللہ ہی رحم کرے''

''باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''صاحب باقی لوگ بھی یہیں ہیں''۔

زینب ملبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''اقبال کہاں ہے؟''

''وہ بچوں کو دیکھنے اسکول گیا ہے''

''تو کیا اسکول بھی......''

''صاحب کچھ پتا نہیں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا''۔

اچانک محبّ کو خیال آیا کہ تفصیلات بعد میں بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت دوسروں کو ملبے سے نکالنا ضروری ہے۔ خدا جانے کون کس حالت میں ہے۔

یہ سوچتے ہوئے محبّ دہل گیا۔ کیونکہ اس کے سامنے کمرے جس حالت میں ڈھے پڑے تھے اس سے صورت حال خطرناک ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ سب سے پہلے کہاں سے شروع کرے۔ مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تب وہ آگے بڑھا اور ملبہ ہٹانے میں مصروف ہو گیا کیونکہ اسے یاد تھا کہ اس سے ذرا فاصلے پر کمرے کے دائیں کونے میں عزیر لیٹا ہوا تھا۔

زینب کے ناتواں بازو جس لکڑی کے سلیپر کو ہٹانے میں ناکام ہو گئے تھے محبّ کے مضبوط بازوؤں نے اسے اٹھا لیا۔ سلیپر کے اوپر پڑے ہوئے پتھر اور سلیب لڑھک کر اِدھر اُدھر گر گئے۔ دھیرے دھیرے جگہ بنتی جا رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ عزیر کہاں سو رہا تھا لہٰذا محبّ اسی جگہ کو خالی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک چوڑے سلیب کے نیچے انسانی بدن دکھائی دے گیا۔

ڈاکٹر محبّ کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا کہ مریض کے صرف سراپا کا جائزہ لینے کے بعد نبض ہاتھ میں لیے بغیر مریض کے تارِ حیات ٹوٹنے کا اشارہ ملنے لگتا ہے۔ لیکن ہر

ڈاکٹر اپنے پیشے کے فطری رجحان کے مطابق آخری اعلان نبض دیکھنے کے بعد ہی کرتا ہے۔

محبّ نے ابھی نبض نہیں دیکھی تھی......بس اشارہ مل رہا تھا۔

تارِ حیات ٹوٹ جانے کا اشارہ۔

روح کا جسم سے جدا ہونے کا اشارہ۔

ڈاکٹر محبّ کی آنکھیں بھرآئیں۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا اور سلیب کو اٹھانے لگا۔ اس نے سلیب تو سنبھال لیا لیکن خود کو نہ سنبھال سکا۔ آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے ہوئے عزیر کے بے جان بدن کو بھگونے لگے۔

محبّ نے سلیب کو ایک طرف کرتے ہوئے عزیر کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اٹھالیا۔ اور کمرے کے ملبے سے باہر آنے لگا۔ زینب ایک طرف ہوگئی۔ عین اسی لمحے گھر کی ٹوٹی ہوئی دہلیز سے کیپٹن زبیر اور بابا شیر دل تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے داخل ہوئے۔

کیپٹن زبیر نے جیسے ہی محبّ کے بازوؤں میں عزیر کو دیکھا تو لپک کر قریب آ گیا سہارا دینے میں مدد کرنے لگا۔ ان چند لمحوں میں کیپٹن نے محبّ کے چہرے پر لکھا سب کچھ پڑھ ڈالا تھا۔ زمین پر لٹاتے ہوئے زبیر نے عزیر کے معصوم چہرے کو دیکھا جہاں درد کی ایک باریک سی لہر بھی نہ تھی۔ شاید سب کچھ آناً فاناً ہوا ہوگا۔ کیپٹن کی زبان پر فوراً کلمہ جاری ہوگیا۔

انالله وانا اليه راجعون.

فضا میں سوگواریت پھیل گئی۔ دور کھڑی ہوئی زینب اپنے آنسو ضبط نہ کرسکی اور رونے لگی۔ بابا شیر دل نے لاش پر اپنا رومال ڈال دیا۔ محبّ کیپٹن زبیر سے گلے لگ کر دلاسہ دینے لگا۔ کیپٹن زبیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کل رات وہ یہاں رکنے کی کتنی ضد کر رہا تھا''۔

''زبیر بھائی! ہمت سے کام لیجئے''۔

''ہاں ہاں! میں ٹھیک ہوں۔ ابھی ہمیں بہت کام کرنا ہے۔ ایک دوسرے کی ہمت بندھانی ہے۔ ورنہ اس مشکل گھڑی سے نکلنا اور مشکل ہو جائے گا''۔

یہ کہتے ہوئے زبیر نے اپنی آنکھوں سے چھلک آنے والے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ پھر وہ بولا۔

''جو کچھ میں تباہی دیکھتا ہوا آ رہا ہوں......الامان الحفیظ...... بہت بڑے اسکیل پر یہ زلزلہ آیا ہے۔ اور کہاں کہاں پر آیا ہوگا کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس وقت رابطے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ سارا انفراسٹرکچر تباہ ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگز گر گئی ہیں۔ جو جہاں ہے بس وہیں تک محدود ہے۔ گھر، مکان، ہوٹل، ہسپتال، اسکول، کچھ سلامت نہیں ہے۔ جو زندہ بچ گئے ہیں۔ ان کی کڑی آزمائش شروع ہونے والی ہے''۔

یہ سنتے ہوئے زینب قریب آ گئی اور بولی۔

''صاحب! کیا اسکول بھی تباہ ہو گئے ہیں؟''

''تو ہمت سے کام لے۔ باقی لوگ کہاں ہیں۔ اقبال کہاں ہے؟''

بابا شیر دل نے زینب سے پوچھا۔

''وہ اسکول گیا ہے۔ بچوں کو لینے''۔

''شہزادی اور اس کے بچے؟''

''وہ یہاں ہیں اور باجیاں اس کمرے میں ہیں''۔

زینب نے ملبے کا ڈھیر بنے ہوئے کمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کیپٹن زبیر نے رومال سے ڈھکے ہوئے عزیر کی طرف دیکھا اور ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ صبر کریں اور ہمت سے کام لیں۔ باقی اللہ پر چھوڑ دیں''۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے اپنے حصے کا کام یہاں نبٹانا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ لوگوں کو ہماری مدد کی ضرورت ہو''۔

''محبّ! یو کانٹ امیجین۔ میں تمہیں ڈیٹیلز بتا نہیں سکتا۔ دیٹ از اے ڈیزاسٹر۔ دیر از نو اینی سنگل بلڈنگ وچ وڈ ہیو ٹو بی سروائیو۔ کین یو بلیو؟''

''اوہ مائی گاڈ''۔

محبّ نے حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثر سے کہا۔

''اس وقت اللہ پاک سے صرف رحم کی دعا کی جائے اور بس''۔

یہ کہتے ہوئے دونوں ملبے کی طرف بڑھ گئے۔

دور کھڑی ہوئی زینب لپک کر قریب آئی تو محبّ نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''اب تم بیٹھو۔ ہم کچھ کرتے ہیں''۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ زندگی کی ساری ترتیب بکھری ہوئی تھی۔ کہیں سکون تھا، نہ آرام۔ بس خوف تھا، ڈر تھا، پریشانی تھی، لاشیں تھیں، زخمی تھے، زمین پر مٹی کے ڈھیر کی طرح بکھرے ہوئے مکان تھے، درد تھا، آہیں تھیں۔

کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہوئی ہو۔ کوئی کلیجہ ایسا نہیں تھا کہ پھٹ نہ گیا ہو، کوئی دل ایسا نہ تھا کہ تڑپ نہ اٹھا ہو، کوئی ذی نفس، بوڑھا، جوان، عورت، بچہ ایسا نہ تھا کہ جس کے رشتوں کے جال کی ڈوری کہیں کہیں سے ٹوٹ نہ گئی۔

اس افراتفری میں دن کے گزرنے کا احساس ہی جاتا رہا تھا۔ سورج سرکتے سرکتے درد میں ڈوبے ہوئے پہاڑوں سے لپٹنے لگا۔ شام نے آ کر پوری وادی میں اداسی کی چادر پھیلا دی۔

اس دوران اقبال بھی مایوس لوٹ آیا تھا۔ بے قرار زینب کچھ اور بے چین و بے قرار ہوگئی۔ ماں کی آس تڑپ اٹھی۔ وہ ٹوٹی دیوار کے سہارے بیٹھ کر سسکنے لگی۔ اس وقت اسے ڈھارس دینے

والا کوئی نہیں تھا۔کوئی بھی نہیں۔

یہ بات اطمینان بخش تھی کہ بابا شیر دل کا مکان آر سی سی کا بنا ہوا نہیں تھا۔اسی لیے سیمنٹ اور لوہے کی سلاخیں رکاوٹ نہیں بنی تھیں۔ پہاڑی پتھر، کہیں چونے مٹی کا گارا تو کہیں سیمنٹ ،لکڑی کی بلیاں اور شہتیر۔یہی سب کچھ ان کمروں کی تعمیر میں استعمال ہوا تھا۔صرف ایک چیز کا استعمال غلط ہوا تھا۔وہ سیمنٹ کے بنے ہوئے سلیب تھے جو چھت میں بچھائے گئے تھے۔

لیکن کسے معلوم تھا کہ یہ علاقہ زلزلے کے پٹی پر واقع ہے اور یہاں بھاری تعمیرات نقصان دہ ہو سکتی ہیں۔ یہ ذمہ داری جن اداروں کی تھی وہ اپنے فرائض سے غافل رہے۔اور ہر گزرتے وقت کے ساتھ یہ پہاڑی علاقے بھاری اور جدید تعمیرات کا جنگل بنتے چلے گئے۔پھر وہی ہوا جو اکثر ہوا کرتا ہے کہ چند غیر ذمہ داروں کی غفلت سے یہاں کے عام آدمی کی زندگی تہہ و بالا ہو گئی۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی اولاد سے بہت محبت کرتا ہے اور جب اس کی اپنی اولاد بھی صاحب اولاد ہو جاتی ہے تو یہ محبت اولاد کی اولاد سے شدت اختیار کر لیتی ہے۔بابا شیر دل کی اس وقت یہی حالت تھی۔اس کے سارے پوتی پوتا اب تک ملبے تلے دبے ہوئے تھے۔اقبال کے بچے اسکول کے ملبے میں تھے اور اب تک نکل نہیں پائے تھے۔اور یہاں سامنے والے کمرے میں اس کے بیٹے دل نواز کے دونوں بچے اور بہو ملبے تلے کس حالت میں تھے کچھ پتا نہیں تھا۔

بابا شیر دل اس بے قراری کی حالت میں کبھی درود شریف پڑھتا کبھی کلمے کا ورد کرنے لگتا اور کبھی استغفار۔پھر یکا یک اس کے لبوں پر کوئی دعا مچلنے لگتی۔اور بوڑھی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

کیپٹن زبیر، محب اور اقبال ملبہ ہٹانے میں مصروف تھے۔اور پھر وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے دکھائی دینے لگے۔ایک ٹوٹے ہوئے بھاری سلیب کو جب کیپٹن زبیر اور محب نے مل کر اٹھایا تو اس کے نیچے سوتی پھول دار قمیص نظر آنے لگی۔ یہ شہزادی تھی۔محب کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔اس نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا۔شہزادی کے جسم میں کوئی حرارت نہیں تھی۔

دونوں نے کمر کے بل گری ہوئی شہزادی کو اٹھایا تو حیران رہ گئے۔شہزادی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کتاب الٰہی کو سینے سے لگا رکھا تھا اور کتاب کے نیچے اس کے دونوں بچے تھے۔یعنی دونوں بچے اللہ کی کتاب کے سائے میں تھے۔

اتنی دیر میں اقبال قریب آ گیا تھا۔اس نے لپک کر شہزادی کی لاش کو سنبھالا۔محبّ اور اقبال شہزادی کو ملبے سے نکالتے ہوئے باہر لے آئے۔زینب دوڑتی ہوئی قریب آ گئی اور گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''زندہ ہے نا؟''

''صبر کر۔صبر سے کام لے۔اس نے اپنے بچوں کو بچالیا''۔

اقبال نے جواب دیا۔

''کہاں ہیں بچے؟''۔

اتنی دیر میں کیپٹن زبیر اور بابا شیر دل آصف اور شائستہ کو اٹھائے ملبے سے نکل آئے۔محبّ نے کہا۔

''خدا کا شکر ہے کہ دونوں بچے زندہ ہیں بس بے ہوش ہیں''۔

''مگر یہ؟''

زینب نے شہزادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ کی مرضی۔ان للہ وانا الیہ راجعون''۔

محبّ خاموش رہا تو بابا شیر دل نے کہا۔یہ سن کر زینب دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔اس کو وہ گھڑی یاد آنے لگی جب قرآن مجید سینے سے لگائے شہزادی اندر کی طرف دوڑی تھی۔یہ وقت انتظار کا نہیں تھا۔لہٰذا تینوں مرد ایک بار پھر ملبے کی سمت بڑھ گئے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ شام تیزی سے گزرے اور ان کے ہاتھ رک جائیں۔

کچے صحن میں اب دو لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے بابا شیر دل نے کیپٹن زبیر سے پوچھا۔

''صاحب! ان لاشوں کا کیا کریں؟''

''بابا کچھ دیر اور رکیں پھر سوچتے ہیں''۔

زبیر نے جواب دیا۔ محبّ اس وقت خاموش تھا۔ جس کمرے کے ملبے کو وہ اب ہٹانے میں مصروف تھا وہاں اس کی نوشین دبی ہوئی تھی۔ اس کی بڑی بہن جیسی نفیسہ تھی، اس کے دو پیارے پیارے بچے تھے اور عزیر کی بیوی اریبہ تھی۔ اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ انہیں کس حالت میں نکالیں گے۔

اچانک ایسا لگا جیسے زمین ہل گئی ہو۔ سب ایک لمحہ کو گھبرا گئے۔ کیپٹن زبیر نے بھاری شہتیر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بڑے زلزلوں کے بعد تادیر ایسے چھوٹے چھوٹے جھٹکے آتے رہتے ہیں۔ یہ اسی کا حصہ ہیں''۔

تینوں تندہی سے کام کر رہے تھے۔ اندھیرا پھیلنے میں بس کچھ دیر رہ گئی تھی۔ چاروں طرف آبادی میں کل تک برقی تاروں کی مدد سے بجلی کی سپلائی موجود تھی مگر صبح کے قیامت خیز زلزلے نے جہاں دوسرے نظام درہم برہم کر ڈالے تھے وہیں بجلی اور مواصلاتی نظام کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ لہٰذا اندھیرا ہونے سے پہلے ملبے میں دبی ہوئی خواتین کو نکالنا ضروری تھا ورنہ یہ کام صبح تک کے لیے ٹل جاتا اور صبح تک......

بابا شیر دل شہزادی کے دونوں بچوں کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دونوں معصوم بچے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ شائستہ اور آصف کو زندہ دیکھ کر زینب کو قرار آ گیا اس نے بڑھ کر دونوں کو اپنے سینے سے چپٹا لیا۔

اس دوران بابا شیر دل کو کچھ خیال آیا اور وہ اٹھ کر باہر کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا تو اس نے اپنی قمیص کے دامن کو جھولی کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہیں قمیص کے دامن کو سیدھا کیا۔ چند سیب لڑھک کر کچی زمین پر گر پڑے۔ شاید اس نے افطار کا انتظام کیا تھا جس کا اب کچھ ہی دیر میں وقت ہونے والا تھا۔ بابا شیر دل نے نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں چھپر کے نیچے باورچی خانہ بنا ہوا تھا۔ وہیں دو بڑی پانی سے بھری ہوئی ناند بھی رکھی رہتی تھیں۔ زلزلے کے بعد ایک ناند سلامت تھی۔ وہیں پڑے ہوئے برتن سے بابا نے پانی نکالا اور سیب دھونے لگا۔ اور پھر تھوڑا پانی نکال کر لایا تا کہ بچوں کو پلایا جا سکے۔ پانی نکالتے ہوئے بابا کو بھینس کا خیال آیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر وہاں بھینس نہیں تھی۔ شاید افراتفری میں وہ کہیں بھاگ گئی تھی۔ بچے صبح سے بھوکے پیاسے اور گھبرائے ہوئے تھے چاروں طرف چیزوں کو بکھری ہوئی حالت میں دیکھ کر وہ ڈر رہے تھے۔ مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ان پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کچھ دیر پہلے وہ ماں کی شفقت اور محبت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اتنی دیر میں زبیر، محب اور اقبال خاصا ملبہ ہٹانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لکڑی کا چوڑا شہتیر جس نے سیمنٹ کے بڑے سلیبوں کو سہارا دیا ہوا تھا نیچے گرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور اس کے نیچے تینوں عورتوں کے پیر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اقبال نے آگے بڑھ کر سلیب کے ٹکڑے ہٹانے شروع کئے تو نفیسہ، اریبہ اور نوشین اور ان کے درمیان میں طلال اور حرا کے بدن بھی نظر آنے لگے۔ ان کے سروں کے پاس گرے ہوئے پتھر ہٹائے تو لمحہ بھر کو دل دہل گیا۔ تینوں کے سروں سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ بدن پر بھی کہیں کہیں چوٹوں کے نشان تھے۔ کیپٹن اور محب نے مل کر شہتیر کو ہٹایا۔ محب نے آگے بڑھ کر ان کے جسموں میں زندگی کی تصدیق کی۔ اس نے اریبہ کو دیکھا۔ بے چینی سے نبض ٹٹولی اور اضطراری انداز سے کہا۔

''نبض چل رہی ہے۔ زندہ ہیں''۔

"تھینکس گاڈ"۔

زبیر نے شکر ادا کیا۔محبّ آگے بڑھا۔اس نے دیکھا یہ نوشین تھی اس کی بیوی۔اس کا اضطراب بڑھ گیا۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوشین کی کلائی پکڑی اور کانپتی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ......یہ بھی......یہ بھی زندہ ہے"۔

کیپٹن زبیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کا شکر ہے"۔

"اللہ تیرا شکر ہے......اللہ تیرا شکر ہے......اللہ تیرا شکر ہے"۔

بابا شیر دل جو قریب آ گیا تھا دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔سب کی آنکھیں بھر آئیں تھیں۔محبّ لپک کر نوشین کے پہلو میں لیٹے ہوئے طلال اور حرا کی طرف گیا۔ ہر چہرہ گرد میں اٹا پڑا تھا۔حرا کی نبض دھیمی دھیمی چل رہی تھی۔محبّ نے اسے دیکھ کر اثبات میں گردن ہلائی مگر جیسے ہی اس کی نظر طلال پر پڑی۔اسے جھٹکا لگا۔اس نے طلال کو گود میں اٹھالیا اور اسے اپنے سینے کے قریب لا کر دیکھنے لگا۔مگر وہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔زبیر بھی سمجھ گیا۔کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔اس نے طلال کو محبّ سے لے لیا۔

"صاحب مجھے دے دیں"

یہ کہتے ہوئے اقبال نے طلال کو لیا اور ملبے سے گزرتا ہوا اس طرف چلا گیا جہاں زینب بیٹھی ہوئی تھی۔

محبّ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔کیپٹن زبیر نے جب یہ دیکھا تو اس کے قریب آ کر بولا۔

"محبّ! آپ ایک بہادر انسان ہیں اور ایک ڈاکٹر بھی۔ یہ بات تو آپ کو کڑے سے

کڑے امتحان میں بھی یاد رکھنی چاہیے''۔

''زبیر بھائی! مجھ میں اب ہمت نہیں ہے''۔

''کیسے ہمت نہیں ہے؟''

''زبیر بھائی! میں اب تک بہت لاشیں دیکھ چکا ہوں''

''چلو شاباش اٹھو۔ ہمت سے کام لو۔ ابھی ہمیں بہت سا کام کرنا ہے''۔

کیپٹن زبیر نے یہ کہہ تو دیا۔ مگر اس کے اپنے اندر ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ صبح عزیر سے لے کر اب تک ایک اک ذی نفس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے چھوتے ہوئے، کبھی زندہ ہونے کی خوشی محسوس کرتے ہوئے تو کبھی کسی کی موت پر آنسو بہاتے ہوئے ہر ہر لمحہ وہ نفیسہ کے لیے بے چین اور بے قرار رہا تھا۔ برسوں پہلے اسے نفیسہ سے اچانک محبت ہوئی تھی۔ پھر برسوں ہی وہ اس کی یاد میں تڑپا تھا۔ جب ملنے کی آس پیدا ہوئی تو وہ شادی سے انکار کر رہی تھی اور اب جب وہ اس کے قریب تھی اور رفتہ رفتہ انکار کا خول اتار رہی تھی تو یہ قیامت کی گھڑی آ گئی اور اس کے اور نفیسہ کے درمیان ایک ناقابل تسخیر رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔

زبیر اپنی حالت کس کو بتاتا اور کیسے بتاتا۔ وہ تو بس اپنے اندر ہی اندر درد سمیٹے ادھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے سچ کہا تھا کہ ابھی ہمیں بہت سا کام کرنا ہے۔ واقعی ابھی انہیں بہت سے فیصلے کرنے تھے۔ اور ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے محب اٹھا اور نفیسہ کے قریب بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اور لمحہ بھر میں یکدم بول اٹھا۔

''زبیر بھائی! باجی زندہ ہیں''۔

زبیر کے چہرے پر ایک لہر سی گزر گئی۔

خوشی کی لہر......

محبت......

زندگی......

چاہت کی لہر......

غم کے اندھیروں کے بعد اچانک مسرتوں بھری روشنی کی لہر۔

دونوں بے اختیار بغل گیر ہو گئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ زبیر اور محب سمیت ہر زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا۔

''اللہ تیرا شکر ہے''۔

نفیسہ کی زندگی نے ان سب کے اندر حرارت سی بھر دی تھی۔ جیسے نفیسہ کو نہیں انہیں زندگی ملی ہو۔ جلدی جلدی وہ سب نفیسہ، اریبہ، نوشین اور حرا کو وہاں سے نکال کر کھلی جگہ پر لے آئے۔

کچے صحن میں نیم کے درخت کے نیچے تین لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ عزیر، شہزادی، اور طلال کی لاشیں۔ دوسری طرف کچھ لوگ بے ہوش تھے۔ زبیر اور محب اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت کی بدولت زندہ لوگوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے، بابا شیر دل، اقبال، زینب ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ نہ کوئی دوا تھی اور نہ کوئی ڈریسنگ کا سامان۔ محب کی کوشش تھی کہ یہ لوگ ہوش میں آ جائیں، ان کے زخموں کی صفائی ہو تا کہ زخم خراب شکل اختیار نہ کر جائیں۔ اس تیمارداری کے دوران زخموں کا معائنہ کرتے ہوئے محب کو پتا چلا کہ نفیسہ کے ایک پیر میں فریکچر بھی ہے۔ تب اس نے نفیسہ کے پیر کو عارضی لکڑیوں کی مدد سے باندھ دیا تا کہ ہڈی ایک جگہ رک جائے۔

اس دوران بابا شیر دل نے ایک برتن میں پانی رکھ کر اس میں بہت سارے نیم کے پتوں کا گچھا ڈال دیا اور دیوار کے پاس تقریباً ٹوٹے ہوئے چولہے پر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ تا کہ زخموں کو صاف کیا جا سکے۔ اور پھر بولا۔

''صاحب! اب تو روزہ بھی مکروہ ہو رہا ہے''۔

''لیکن اذان کی آواز تو نہیں آئی؟''

''کہاں سے آئے گی۔امام صاحب کے اپنے گھر میں دو جنازے رکھے ہیں''۔

''آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''ابھی جب افطار کے لیے سیب لینے گیا تب۔صاحب موت نے ہر گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر آیا اور سب کی طرف ایک ایک سیب بڑھانے لگا۔

کسی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ کھائے۔بھلا کوئی بھی شخص ایسے ماحول میں جہاں اپنوں کی بے گور و کفن لاشیں پڑی ہوں، کچھ زخمی ہوں اور کچھ سوگوار، کیسے اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھر سکتا ہے۔لیکن مجبوری تھی کہ افطار کرنا روزے کے واجبات میں سے ایک ہے۔سب نے تھوڑا تھوڑا سا سیب چکھ لیا۔

نیم کے گرم پانی سے محبّ نے نفیسہ کے سر کے زخموں کو صاف کیا۔زینب نے اقبال کی مدد سے ملبے سے اپنا وہ بکس نکلوا لیا تھا جس کی آڑ لے کر محبت نے اپنا سر بچایا تھا۔دو چادریں لاشوں پر ڈال دی گئیں۔اور ایک اجلی چادر کی پٹیاں بنا کر زخموں پر باندھنے کا کام لیا جانے لگا۔

اس دوران کیپٹن زبیر ایک طرف بیٹھا خلا میں مسلسل تکتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔وہ جانتا تھا کہ شہزادی کی تدفین تو یہیں کہیں ہو جائے گی لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے بھائی عزیر اور نفیسہ کے بیٹے طلال کے بارے میں کیا کرے۔وہ دن میں کئی بار اپنا سیل فون چیک کر چکا تھا تاکہ کراچی میں اپنے امی ابو کو عزیر، اریبہ اور اسلام آباد میں میجر نہال کو نفیسہ اور بچوں کے بارے میں بتا سکے۔مگر وہ ناکام رہا تھا۔محبّ کا سیل فون ملبے میں دب چکا تھا۔اس کے علاوہ ان کے پاس رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔وہ اپنے ابو سے عزیر کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔پھر اسے ایک خیال نے جکڑ لیا۔اریبہ اور نفیسہ کے ہوش میں آنے پر انہیں عزیر اور طلال کے بارے میں کیسے بتایا جائے۔ان دونوں کی حالت ایسی نہیں کہ انہیں یہ صدمے کی خبر دی جائے۔لیکن ان

حالات میں کچھ چھپانا یا جھوٹ بولنا ناممکن تھا۔ زبیر یہ سوچ کر پریشان ہونے لگا۔ پھر اس نے عزیر، شہزادی اور طلال کی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بابا شیر دل سے کہا۔

''بابا یہاں کچھ آڑ لگادو''۔

بابا شیر دل نے ملبے سے ٹوٹا ہوا دروازہ اٹھایا اور وہاں کھڑا کر کے ایک آڑ سی بنادی۔

تھوڑی دیر میں نوشین، اریبہ اور نفیسہ کو ہوش آنے لگا۔ کمزوری اور نقاہت بھرے چہرے پر ہلکا ہلکا خوف بھی تھا۔ نوشین نے محبّ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت امڈ آئی۔ محبّ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''معمولی چوٹیں ہیں۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی''۔

''ہوا کیا تھا؟''

''کچھ نہیں......زلزلہ آیا تھا''۔

''سب خیریت سے ہیں نا؟''

''پریشان مت ہو۔ سب خیریت سے ہیں۔ تم بھی آرام کرو۔ اپنے آپ کو ہلکان مت کرو''۔

زینب نے اریبہ کا سر گود میں لے رکھا تھا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اریبہ اور نفیسہ نے بیک وقت پریشان کن سوال کر ڈالا۔

''زبیر بھائی! عزیر کہاں ہے؟''

''محبّ! میرے بچے؟''

نہ کوئی جواب کیپٹن زبیر کے پاس تھا اور نہ ڈاکٹر محبّ کے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور گردن جھکالی۔ دونوں کی خاموشی نے انہیں اور الجھا دیا۔ زینب بولی۔

''بی بی جی! حرا تو آپ کے پاس ہی لیٹی ہوئی ہے''۔

''اور طلال؟''

زینب خاموش ہوگئی۔نفیسہ نے بے قرار ہوکر اٹھنے کی کوشش کی مگر سر چکرا گیا اور پیر میں درد کی لہر دوڑ گئی۔محبّ اس کے قریب آ گیا اور بولا۔

''آپ کے پیر میں فریکچر ہے۔آپ اٹھنے کی کوشش مت کریں''

''فارگاڈ سیک۔مجھے میرے بیٹے کے بارے میں بتاؤ''۔

محب نے بے بسی سے دیکھا۔نفیسہ کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔اس کی مامتا تڑپ اٹھی۔ وہ مچل گئی اور تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''محبّ''۔

محب نے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ وہاں لیٹا ہوا ہے''۔

''وہاں کیوں؟''

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے''۔

''حالت ٹھیک نہیں ہے؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟''۔

وہ ایک لمحہ رکی۔اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آیا۔موت کا خوف۔وہ بولی۔

''کہیں وہ......؟''

اریبہ جو لمحہ بھر کو کچھ کہنا بھول گئی تھی اور نفیسہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی، جملوں کے بین السطور میں چھپے ہوئے معنی سمجھ گئی تھی۔اسے بھی ڈرا دینے والے آسیب نے گھیر لیا۔وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور زبیر سے پوچھا۔

''زبیر بھائی! کیا عزیز بھی؟''

کوئی کچھ نہ بولا۔کیا کہتے۔کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔زبیر جو بہت دیر سے

جنہیں بتانے سے ڈر رہا تھا وہ کہنے سننے کے مرحلے سے آگے نکل گئے تھے اور بغیر کہے سنے سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ اریبہ اور نفیسہ چیخیں مار کر رونے لگیں۔ دونوں کو سنبھالتے ہوئے سب ہی رونے لگے۔ تسلی کے دو لفظ کہنے سے قرار مل سکتا تھا۔ لیکن کون کسے تسلی دیتا۔ سب ہی ایک جیسے دکھ اور کرب سے گزر رہے تھے۔ پہاڑوں پر مکان تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بنے ہوئے ہونے کے باوجود لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن اس وقت تو ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ ہر گھر کی فضا سوگوار تھی۔ بلکہ پوری وادی پر سوگواریت چھائی ہوئی تھی۔

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رونے کی آوازیں آہستہ آہستہ سسکیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں اور پھر دھیرے دھیرے اندھیرے کے ساتھ ساتھ خاموشی نے بھی پر پھیلا دیئے۔ زینب نے زبردستی تینوں کو سیب کھلانا چاہا تو انہوں نے منع کیا۔ تب زینب نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''باجی مجھے دیکھیں۔ میرے تینوں بچوں کا ابھی تک کچھ پتا نہیں ہے۔ پتا نہیں کس حالت میں ہیں۔ یہاں گھر اُجڑ گیا۔ شہزادی چلی گئی۔ اس کے دونوں معصوم بچے اکیلے رہ گئے''۔

یہ سن کر نفیسہ کو اپنا دکھ بہت کم محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں زینب کے لیے محبت بھرے جذبات ابھر آئے۔ اس نے زینب کا ہاتھ تھام لیا۔ اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بچے مل جائیں گے۔ کہاں ہیں وہ؟''

''باجی اسکول کی چھت گر گئی۔ بہت سارے بچے ابھی تک اس میں دبے ہوئے ہیں''۔

''یا اللہ خیر''

نفیسہ نے کہا۔ ان تینوں کو وادی کی صورت حال کا کچھ علم نہیں تھا۔ زینب دھیرے دھیرے انہیں گزرنے والی قیامت اور تباہی کے بارے میں بتانے لگی۔ اسے خود زیادہ معلوم نہیں تھا۔ البتہ جو کچھ اب تک سنا وہی اس نے بتا دیا۔ جسے سن کر اریبہ، نوشین اور نفیسہ کانپ کر رہ گئیں۔

حرا کو ہوش آ گیا تھا۔ وہ نفیسہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ حرا طلال کے بارے میں کچھ نہیں جانتی

تھی۔چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے اور سناٹے سے ڈر کر وہ اپنی امی کے سینے سے لپٹ گئی۔نفیسہ نے بھی اسے زور سے بھینچ لیا۔

اس کے دو پھولوں میں سے ایک پھول مرجھا کر دروازے کی آڑ میں چھپا ہوا پڑا تھا۔وہ بے قرار ہوگئی۔اس نے بھرائی ہوئی آواز میں محب سے کہا۔

''کم از کم مجھے دکھا تو دو''۔

محب اُٹھا اور طلال کو بازوؤں میں بھر کر اٹھا لایا۔نفیسہ نے دیکھا تو ماما سے مچل کر بانہیں پھیلا دیں۔اس نے حرا کو گود سے جدا کئے بغیر ہی طلال کو سینے سے لگا لیا اور بے ساختہ اسے پیار کرنے لگی۔ممتا کی آنکھوں سے آنسو تڑپ تڑپ کر گرتے رہے۔جسے دیکھ کر ہر آنکھ نم آلود ہونے لگی۔معصوم حرا کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔وہ تو بس ٹک ٹک نفیسہ کو تک رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد محبّ نے طلال کو نفیسہ سے لیتے ہوئے کہا۔

''باجی!طلال کو مجھے دے دیجئے اور اپنے آپ کو سنبھالیے''۔

''کیسے سنبھالوں؟ یہ میرا بیٹا ہے''۔

''کچھ بھی سہی سنبھالنا تو ہوگا''۔

یہ کہتے ہوئے محبّ نے آہستہ سے مزید کہا۔

''آپ کا دکھ زینب کے دکھ سے بڑا نہیں ہوسکتا''۔

یہ سنتے ہوئے نفیسہ نے محب کو دیکھا۔اسے لگا واقعی محبّ صحیح کہہ رہا ہے۔وہ خاموش ہوگئی۔ اسی دوران کچھ سوچتے ہوئے اریبہ اٹھی اور عزیر کی طرف جانے لگی۔اسے کسی نے نہیں روکا۔زبیر کی ویسے بھی خواہش تھی کہ وہ ہمت سے کام لے۔اسی لیے وہ خاموش رہا۔اریبہ قریب جا کر بیٹھ گئی۔سر سے چادر سرکائی۔عزیر آنکھیں بند کیے ایسے لیٹا تھا جیسے سو رہا ہو۔اریبہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسوؤں کی جھڑی برسنے لگی۔

دھیرے دھیرے اسے یقین آنے لگا کہ وہ ذہین اور جمالیاتی ذوق سے مالا مال عزیر کو کھو چکی ہے۔ دنیا کی خوبصورتی اور زندگی کے حسن کو اپنے تخلیقی ذہن سے تصویر کرنے اور روح کو سرشاری عطا کرنے والا خود روح اور بدن کے تعلق سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ تب یکا یک اریبہ کو اپنے دل میں شدید ٹیس سی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے کوئی سلاخ پیوست ہو گئی ہو۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ پسینے میں شرابور ہونے لگی۔ گھبراہٹ میں اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا ہو رہا ہے۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دیوار کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا۔

سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کو بھی اریبہ پر طاری ہونے والی کیفیت کا اندازہ نہیں تھا۔ سب اسے غم پر محمول کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اریبہ کا غم کچھ ہلکا ہو جائے۔ اریبہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں دور لیٹے ہوئے عزیر پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا دل دھیرے دھیرے بیٹھتا جا رہا تھا۔ اس کا بدن لحہ بہ لحہ شانت ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی بجھتی چلی گئی۔ دھڑکنیں مدہم سے مدہم ہونے لگیں۔ اور اس کی روح بہت خاموشی اور پرسکون احساس کے ساتھ زندگی کے سمندر میں کوئی ہلچل پیدا کیے بغیر جسم سے جدا ہوتی چلی گئی۔

نہ خاموشی کا تسلسل ٹوٹا، نہ ہوا میں ارتعاش پیدا ہوا اور نہ ہی کسی کو کچھ نظر آیا۔ اندھیرا گہرا اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

سناٹا کچھ اور بڑھ گیا۔ جسے زلزلہ نہ ہرا سکا اسے صدمے نے پچھاڑ دیا تھا۔ مگر یہ کیسی ہار تھی کہ ہارنے والے کو اور دوسروں کو بھی کچھ پتا نہ چل سکا۔ وہ تو زینب کٹورا بھر پانی لے کر اریبہ کے پاس نہ آئی ہوتی تو دیر تک کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ان کے گرد لاشوں میں ایک اور لاش کا اضافہ ہو گیا ہے۔

زینب چیخی تو سب چونک اٹھے اور اس کی طرف دوڑے۔ محبّ نے دل کی حرکت کو

لوٹانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام ہوگیا اور اپنی بے بسی پر جھنجلا اٹھا۔ نفیسہ اور نوشین نے ابھی تھوڑی دیر پہلے موت کا سنا تھا مگر اب انہوں نے خود ہی دیکھ بھی لیا۔ دونوں بہت ڈری اور سہمی ہوئی اریبہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ایک رات پہلے یہیں شہزادی کی خوبصورت آواز میں کشمیری گیتوں پر اپنے نازک ہاتھوں کی تال دے رہی تھی مگر اب نہ وہ گیت سنانے والی زندہ تھی اور نہ وہ تال دینے والی۔

کیپٹن زبیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کسی خیال کے تحت وہ یکا یک اٹھا اور بابا سے مخاطب ہوا۔

''بابا! یہاں قبریں کھودنے کے لیے کچھ ہوگا؟''

''صاحب اس وقت؟''

''ہاں بابا! ہمیں یہ کام اسی وقت کرنا ہوگا''۔

پھر زبیر محب سے مخاطب ہوا۔

''محب! یہ سچوئشن نارمل نہیں ہے۔ لہذا ہمیں نارمل سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنا بھی ہوگا''۔

''اب صبح میں صرف چند گھنٹے ہی تو ہیں''۔

''یہ چند گھنٹے بھی بہت بھاری ہوں گے۔ جہاں لمحوں کا گزارنا مشکل ہو وہاں گھنٹوں کو کیسے گزار پائیں گے۔ بس میرے دل میں بار بار ایک خیال آ رہا ہے کہ اگر عزیر کی لاش یہاں سامنے نہ رکھی ہوتی اور ہم اسے پہلے ہی دفنا چکے ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ اریبہ اس عذاب سے نہ گزرتی جس سے وہ ابھی گزری ہے۔

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔

''یوں بھی ایک فوجی ہونے کے ناتے میں نے ایک دن اور ایک رات یہاں گزاری ہے۔ بغیر کسی اطلاع کے اپنی ڈیوٹی سے دور۔ پتا نہیں میں نے اپنی وردی کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے

کہ نہیں۔لہذا ہمیں جو کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔میں صبح اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا چاہتا ہوں''۔

اس کی بات سن کر اقبال نے کہا۔

''میں صبح کھیتوں میں اپنا پھاوڑا کیتی چھوڑ آیا تھا''۔

''جا کر لے آؤ یا کہیں سے بندوبست کرو''۔

''اقبال جانے لگا تو بابا شیر دل نے کہا''۔

''چل میں بھی چلتا ہوں۔اگر کسی کے ہاں سے مل جائے تو میں بھی لے آتا ہوں''۔

دونوں باپ بیٹے چلے گئے تو محبت نے زبیر سے کہا۔

''کل صبح میں بھی ڈیوٹی پر حاضر ہونا چاہتا ہوں''۔

''کیا مطلب؟''

''میں ایک ڈاکٹر ہوں۔میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ان پہاڑوں پر تباہی کا جواب تک میں نے اندازہ لگایا ہے، وہ دل ہلا دینے والا ہے اور اگر اتنا ہے جتنا آپ نے شہر میں دیکھا، تو اس کا مطلب میری یہاں بہت ضرورت ہے۔نفیسہ باجی اور نوشین کو کسی طرح اسلام آباد بھجوا کر یہاں کے لیے کچھ ......''

''میں کہیں نہیں جا رہی''۔

نوشین نے جملہ اُچکتے ہوئے کہا۔

''تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے ورنہ میں تمہیں خود کہتا''۔

''اس پروفیشن کے لیے جو تم نے اوتھ اٹھایا ہے وہی میں نے بھی اٹھایا ہے۔تم کوئی فرض ادا کرنا چاہتے ہو تو یہی فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔اور ویسے بھی بہت سارے معاملات ایسے ہوتے ہیں جس میں لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت پڑتی ہے۔لہذا میں بھی تمہارے ساتھ یہیں رہوں گی''۔

نوشین نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ محبّ نے نوشین کو محبت سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ زبیر بھی اسے احترام سے مسکرا کر دیکھنے لگا۔ زندہ لوگ عجیب و غریب حالات سے گزر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں ان پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے اور ذرا سی دیر میں وہ مسکرانے کا سامان بھی پیدا کر لیتے۔

نفیسہ حرا کو سینے سے لگائے خاموش رہی۔ پیر کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے اسے اندازہ تھا کہ وہ یہاں لوگوں کی مدد کے بجائے ان کی مشکلات میں اضافہ کرے گی۔ ورنہ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ بھی ان لوگوں کے شانہ بشانہ اور قدم سے قدم ملا کر امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیتی۔

تھوڑی دیر میں اقبال اور بابا شیر دل پھاوڑا اور گینتی لیے چلے آرہے تھے۔ زبیر نے دیکھا تو محبّ سے بولا۔

''آؤ محبّ! ہم اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو لیں''۔

باہر نکلتے ہوئے اسے کچھ خیال آیا۔ وہ چونکتے ہوئے پلٹا۔ اور نفیسہ سے براہ راست مخاطب ہوا۔

''میں آپ سے اجازت لینا تو بھول ہی گیا۔ میں عزیر اور اریبہ کی طرح طلال پر بھی اپنا حق سمجھ رہا تھا۔ آئی ایم سوری''۔

پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''میں عزیر اور اریبہ کو یہیں امانتاً دفنا رہا ہوں۔ کیونکہ یہی مناسب ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو طلال کو بھی......''

زبیر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ نفیسہ سے اس کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا۔ یہ میں آپ پر چھوڑتی ہوں۔ میری طرف سے آپ کو اختیار ہے''۔

مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا زبیر اور محبّ باہر چلے گئے۔

(۱۵)

رات کے سناٹے میں کچھ دیر زمین پر گینتی چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی خاموشی چھا جاتی اور تھوڑی دیر بعد پھر گینتی چلنا شروع کر دیتی۔

کھچ......کھچ......کھچ......

پہاڑوں کے آس پاس دوسرے گھروں میں بھی یہی سب دن بھر ہوتا رہا تھا۔ ہر شخص کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور ہر شخص اس ہلچل کے نتیجے میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔ کہیں کہیں پورے پورے گھر اجڑ گئے اور کاندھا دینے والا کوئی نہیں بچا اور کسی کسی کے ہاں زخمیوں اور معذوروں کی قطار تھی اور طبی سہولت ناپید۔ ہر ایک کا غم مشترک تھا لیکن مختلف بھی۔

جس وقت اقبال زمین کھود رہا تھا اور بابا شیر دل، کیپٹن زبیر اور محبّ مٹی سرکا کر قبریں بنا رہے تھے اس وقت بابا شیر دل کے مکان کے ذرا نیچے پہاڑ کے دامن میں رات بھر بانسری کی دھن

پر خوبصورت نغمے الاپنے والے لڑکے کے گھر کے پاس اسکول پرنسپل ریاض احمد کے گھر میں اس کی بیوی مہہ جبیں کے اچانک درد اٹھنے لگے۔ وہ بے قرار ہوگیا۔ تھوڑی دیر پہلے ریاض کی ساس نے ایک دائی کا پتا بتایا تھا۔ مگر بوڑھی دائی کا زلزلے میں ایک بازو ٹوٹ گیا تھا اور وہ اس قابل نہیں تھی کہ کوئی کام کر سکے۔

ایسے میں بانسری والے لڑکے نے اچانک اندھیرے میں چراغ روشن کر دیا۔ اس نے ریاض احمد کو بتایا کہ پہاڑی کے اوپر اقبال بھائی کے گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جن میں ایک ڈاکٹر ہیں۔

''مگر یہاں تو ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے''۔

ریاض احمد نے کہا۔ تو مہہ جبیں کی امی نے کہا۔

''بیٹا جا کر دیکھو۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ کوئی سبیل پیدا کر دے''۔

''ٹھیک ہے''۔

ریاض احمد اقبال کو جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے تینوں بچے اسکول کے ملبے تلے اب تک دبے ہوئے ہیں۔ اس نے شام کو بہت کوششیں کی تھیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر بھی گیا تھا جہاں سے اسے یہ تسلی دی گئی کہ بہت جلد راستے بحال ہوتے ہی اسلام آباد اور دیگر شہروں سے امداد آ جائے گی اور بھاری مشینری بھی منگوائی جا رہی ہے۔ تا کہ ملبہ ہٹانے کا کام آسان ہو سکے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے انہوں نے پچاس سے زائد بچوں کو نکال لیا تھا۔ جن میں بیس سے زیادہ بچے زخمی حالت میں تھے اور باقی انتقال کر چکے تھے۔ بچوں کو ان کے ماں باپ کے حوالے کرنے کے بعد جب اندھیرے میں مزید امدادی کاروائی ناممکن ہوگئی تو وہ گھر لوٹ آیا۔ جہاں اس کی ضرورت تھی۔

صبح جب اس نے مہہ جبیں کو اور اس کی امی کو شہر کے ہسپتال کے باہر عاشق علی کے حوالے کیا تو اس کے بعد سے اب تک وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ عاشق علی ان خواتین کو کس طرح گھر تک لایا۔

مہہ جبیں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے ان سنگین حالات میں یوں سفر کروایا جاتا لیکن شہر میں ہر ہسپتال اور ہر عمارت کا بہت برا حال تھا ایسے میں یہی مناسب تھا کہ انہیں گھر لے آیا جائے۔

ریاض احمد کے گھر کا بھی وہی حال تھا جو دوسروں کا تھا۔ اس کی امی بھی بہت زخمی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف عاشق علی کی چھوٹی بیٹی رباب اب تک اسکول کے ملبے میں دبی ہوئی تھی اور آس کی ڈوری کمزور سے کمزور ہوتی جارہی تھی۔ مگر ایک نئی زندگی کی امید نے ان کا دھیان دو سمتوں میں بانٹ دیا تھا۔ اور اس وقت گھر میں موجود ہر شخص کی خواہش تھی کہ کہیں سے کوئی ڈاکٹر کا بندوبست ہو جائے۔

ریاض احمد کے یہاں یہ پہلے بچے کی ولادت تھی۔ وہ گھبرایا گھبرایا سا بانسری والے لڑکے کو ساتھ لیے رات کی تاریکی میں پہاڑی پگڈنڈری پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی دعا تھی۔

"یا اللہ کوئی لیڈی ڈاکٹر مل جائے"

وہ نہیں جانتا تھا کہ خدا نے اس کی دعا قبول کر لی ہے۔ وہ جب اقبال کے گھر کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ اقبال اور بابا شیر دل کے کھیتوں کے قریب پہاڑی کے دامن میں کچھ قبریں کھدی ہوئی ہیں۔ پاس ہی عام کپڑوں میں چار جنازے رکھے ہیں اور چار آدمی نمازہ جنازہ کی نیت باندھ رہے ہیں۔ ریاض نے تیزی سے قدم بڑھائے اور جلدی سے نماز جنازہ میں شامل ہو گیا۔

چاروں طرف پھیلی ہوئی رات کی تاریکی میں اللہ تعالی کی حمد و ثنا سے دل روشن و منور ہونے لگے۔

سبحانک اللھم و بحمدک و تبارک ا سمک وتعلی جدک ولا الہ غیرک.

اے اللہ تو پاک ہے......

سب تعریف تیرے لیے ہے......

تیرا نام سب سے بلند ہے......

تیری ذات سب سے اعلیٰ ہے......

اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد عزیر، ادیبہ، شہزادی، اور طلال کو زمین کا رزق بنادیا گیا۔ اس دوران ریاض سے کسی نے آنے کا سبب نہیں پوچھا۔ مگر جیسے ہی تدفین و فاتحہ سے فارغ ہوئے تو اقبال نے کہا۔

''صاحب! یہ ریاض بابو ہیں۔ ہمارے گاؤں کے ہیں۔ میرے بچے ان کے ہی اسکول میں پڑھتے تھے''۔

''اچھا اچھا...... کیسے ہیں آپ؟ کتنے بچے ملبے سے نکل آئے؟''

کیپٹن زبیر نے پوچھا۔

''سر! ہم نے اپنی پوری کوشش کی ہے۔ تقریباً ساٹھ بچے نکالے جاچکے ہیں۔ مگر اب ہمیں بھاری کرین یا ایسی ہی کوئی بڑی مشینری درکار ہے۔ لیکن سر! اس وقت تو میں ایک اور ضرورت کے تحت آیا ہوں۔ میری بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔ شی از پریگنینٹ۔ مجھے پتا چلا تھا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں''۔

ریاض نے اپنا مدعا بیان کیا۔ تو زبیر نے کہا۔

''آیئے وہاں چل کر بات کرتے ہیں''۔

یہ کہتے ہوئے وہ سب بابا شیر دل کے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ محبّ جواب تک خاموش تھا بولا۔

''اس وقت آپ کو ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میری مسز بھی ڈاکٹر ہیں۔ وہ یہاں موجود ہیں''۔

ریاض خاموش رہا۔ اس کی دعا قبول ہوچکی تھی۔ ذرا دیر میں وہ گھر پہنچ گئے۔ نوشین کو جب

پتا چلا تو وہ فوراً جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں چار افراد کا قافلہ ریاض احمد کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ جہاں صبح سے مہہ جبیں خوف کی حالت میں تھی جس کی وجہ سے بچے کی ولادت میں پیچیدگی کا اندیشہ تھا۔

محبّ اور نوشین کے جانے کے بعد نفیسہ تنہا ہوگئی۔ حرا اس کے سینے پر سر رکھے سوگئی تھی۔ زینب نے اسے لے کر علاحدہ لٹا دیا۔ بابا شیر دل اور اقبال ایک طرف سر جھکائے بیٹھ گئے۔ کیپٹن زبیر ٹوٹی ہوئی دیوار کے سہارے ہاتھ باندھے کھڑا ہوا خلا میں گھور رہا تھا۔ اندھیرا چاروں طرف خوف کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔

چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑ اندھیرے میں اپنے بلند و بالا قد کے ساتھ منظر کو اور ہیبت ناک بنا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس میں خنکی کا احساس موجود تھا۔ نفیسہ نے کہنی کے بل سرکتے اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے خاموشی کے اس گہرے سمندر میں لفظوں کی کنکریاں پھینک کر ارتعاش پیدا کردیا۔ وہ بولی۔

''مجھے عزیر اور اریبہ کے اس طرح جانے کا بے حد افسوس ہے۔ ان حالات میں یہ جملے رسمی لگتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ دونوں بہت پیارے تھے''۔

''بالکل آپ کے طلال کی طرح''۔

یہ کہتے ہوئے زبیر نفیسہ کے قریب چلا آیا۔ اور ذرا فاصلے پر ٹوٹی ہوئی دیوار کے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

''دکھ، تکلیف یا غم ہمیشہ نہیں رہتے۔ اس وادی پر آج جو افتاد پڑی ہے۔ یقیناً اس کا مداوا برسوں نہیں ہوسکے گا۔ لوگوں کو اس غم سے باہر نکلنے میں نہ جانے کتنے دن لگیں گے۔ اور ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس قیامت خیز تباہی کا دائرہ کتنا بڑا ہے۔ اس نے کہاں تک کے لوگوں کو متاثر کیا ہے''۔

''اگر صبح آپ مجھے اسلام آباد بھجوانے کا بندوبست کر سکیں تو میں مشکور رہوں گی۔ میں آپ کے لیے پریشانی کا سبب بننا نہیں چاہتی''۔

''اگر آپ ٹھیک ہوتیں تو میں خود آپ سے کہتا کہ یہاں رہیے اور لوگوں کی خدمت کیجئے۔ لیکن اس حالت میں میں خود چاہوں گا کہ آپ آرام کریں''۔

''دراصل جو صورت حال میں سن رہی ہوں اس سے مجھے اندازہ ہے کہ آپ جیسوں کو بڑے ریسکیو آپریشن کی ذمہ داری نبھانا ہوگی''۔

''یہ ذمہ داری میں پہلے بھی نبھاتا رہا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے زبیر کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ نفیسہ چونکی کہ یہ موقع مسکرانے کا تو نہیں ہے۔ اس نے زبیر کی طرف دیکھا مگر وہاں ایک بار پھر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

رات سرکتے سرکتے اپنے انجام تک پہنچنے والی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہلکی ہلکی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں دیر سے چھپا ہوا ہلکا ہلکا کہر فضا میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

''صبح ہونے والی ہے''۔

نفیسہ نے دھیرے سے کہا۔

''ہوں! واقعی ایک نئی صبح ہونے والی ہے''۔

''خدا کرے اب لوگوں پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ سب امان میں رہیں''۔

زبیر نے دھیرے سے آمین کہا اور نفیسہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نفیسہ''۔

''ہوں؟''

نفیسہ زبیر کے منہ سے اپنا نام سن کر چونکی۔ اس نے زبیر کی طرف متجسس نظروں سے دیکھا

جہاں گہری سنجیدگی طاری تھی۔ کچھ لمحہ توقف کے بعد زبیر نفیسہ کے نزدیک آ گیا اور گویا ہوا۔

"برسوں پہلے کی بات ہے۔ ایک ایسی ہی صبح جب سیلاب کے پانی میں کچھ فوجی ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کی سربراہی میں کالج کی چند لڑکیوں کو بچانے پہنچے تھے۔ وہاں اس سیکنڈ لیفٹننٹ کو ایک لڑکی سے اچانک محبت ہو گئی تھی۔ وہ سیکنڈ لیفٹننٹ آج بھی اس لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے اپنے گھر کی کیپٹن بنانا چاہتا ہے"۔

نفیسہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ زبیر کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کی یادوں کی کتاب سامنے کھلی پڑی تھی۔

تصویریں پلٹ رہی تھیں۔

صفحے اڑ رہے تھے۔

حرف مچلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ وہ سارے دکھ بھول کر خوش گوار حیرت سے زبیر کو دیکھ رہی تھی جو اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ حیران و پریشان نفیسہ نے کہا۔

"حیرت ہے! میں یہ کیسے بھول گئی؟ یہ بات مجھے ان چار دنوں کے دوران بھی یاد نہیں آئی"۔

اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ وادی میں چاروں طرف روشنی پھیل رہی تھی۔ پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے سے سورج دھیرے دھیرے اپنی کرنیں وادی میں بکھیر رہا تھا۔

کیپٹن زبیر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر نفیسہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لب خاموش اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ڈاکٹر محب اور ڈاکٹر نوشین دروازے سے داخل ہوئے اور بولے۔

"ان ہلاکتوں کے بعد وادی میں ایک بچے کی ولادت مبارک ہو"۔

☆☆☆